جینے کی بات اور ہے

نسیم فیاض

جینے کی بات اور ہے

سورج کی آخری کرنیں پگھلے ہوئے سونے کی طرح آسمان پر پھیلی ہوئی تھیں۔ شام کے دھندلے سائے دور اُفق پر پھیل رہے تھے فضا میں میٹھی میٹھی موسیقی رچی ہوئی تھی۔ ہر شے گنگناتی ہوئی معلوم ہورہی تھی۔ میں باہر گراؤنڈ میں فوارے کی منڈیر پر لیٹی پاپا کا انتظار کر رہی تھی۔فوارے پر بنا محبت کا دیوتا کمان تانے کھڑا تھا۔ میں بڑی محویت سے فوارے سے پھوٹتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کب پاپا میرے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔

''پاپا! آپ آ گئے—'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ہوں—''

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن دنوں وہ بہت مصروف تھے۔ نامعلوم کیا مصروفیت تھی۔ان کے چہرے پر گہری اُداسی اور تھکاوٹ کے ملے جُلے تاثرات تھے۔

''چائے منگواؤں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں—''

''کیا بات ہے— آپ کچھ پریشان ہیں پاپا؟''

''سوچتا ہوں کیا ہم ایک دوسرے سے جدا رہ کر زندہ رہ سکیں گے؟'' وہ گہرا سانس لے کر بولے۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''سمجھ جاؤ گی۔''

وہ اٹھ کر میرے قریب کھڑے ہوگئے اور مجھے اپنے ساتھ لگا لیا میرے دل کی دھڑکنیں سہم گئیں پاپا آٹھ دس دن سے پریشان تھے۔ میں نے کئی بار پوچھا بھی لیکن اُنھوں نے ٹال دیا۔

چائے بڑی خاموشی سے ختم ہوگئی۔

پاپا میرے سر پر ہاتھ رکھے نامعلوم کیا سوچتے رہے۔ میری آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ لیکن میں نے انھیں گرنے نہ دیا۔ حالانکہ کوئی ایسی بات بھی نہ تھی۔ مگر دل پر ایک بوجھ سا تھا۔

''روبی! ایک خوشخبری سنو گی؟'' آخر انھوں نے کہا۔

''خوشخبری! پاپا وہ خوشخبری کبھی نہیں ہے۔ آپ کا چہرہ میرے لیے کُھلی کتاب ہے ضرور کوئی بری بات ہے جسے سُنانے میں آپ کو تامل ہے۔''

''نہیں! نہیں بُری خبر نہیں ہے۔'' وہ اُداسی سے مسکرائے۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ حکومت مجھے ریسرچ کمیٹی کا لیڈر بنا کر کچھ دنوں کے لیے باہر بھیجنا چاہتی ہے۔ اور——''

''کتنے دنوں کے لیے؟'' میں نے بات پوری نہ ہونے دی۔

''میں نے بہت کوشش کی کہ تمھیں ساتھ لے جاسکوں۔ مگر——'' وہ رُکے۔ ''اجازت نہیں ملی۔ پھر تمھارا حرج بھی تو ہوگا۔ وقت کا کیا ہے گذرتے پتہ ہی نہیں چلتا۔ پھر تمھارے لیے یہ بات بھی تو قابل فخر ہے کہ حکومت نے اتنے بڑے کام کے لیے مجھے چُنا ہے۔'' یوں محسوس ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو تسلیاں دے رہے ہیں۔

''پاپا! آپ کب لوٹیں گے؟'' میری آنکھوں پر آنسوؤں کے پردے حائل ہو رہے تھے۔

زیادہ دیر نہ لگے گی۔ بس کام ختم ہوتے ہی لوٹ آؤں گا۔''

''پھر بھی اندازاً— میں نے اصرار کیا۔

''دیکھو ناز! زیادہ وقت نہیں ہے حکومت ہمیں تین سال کے لیے بھیج رہی ہے اگر کام ختم نہ ہوا تو شاید کچھ دیر اور لگ جائے۔

شاید اس بات کا ردعمل وہ نہ دیکھنا چاہتے تھے جو اُنہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''پاپا! آپ تو کہتے تھے کچھ دنوں کے لیے جا رہا ہوں۔ یہ تین سال تین صدیاں ہیں۔ نامعلوم آپ آئیں تو یہ غم مجھے ختم ہی کر چکا ہو۔'' میری آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

''پگلی بیٹی۔'' وہ مجھے پیار کرتے ہوئے بولے۔''اتنا سا دل ہے تمھارا۔ میں کوشش کروں گا درمیان میں ایک آدھ چکر لگا جاؤں یا پھر تمھیں وہاں بلا لوں گا۔''

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری دنیا گھوم رہی ہے۔ پاپا سے جدا رہ کر زندگی کیسے گذرے گی؟ میں نے آج تک اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔

''مگر پاپا! میں اکیلے کیسے رہوں گی؟'' میں نے صرف امید پر کہا کہ شاید اس طرح وہ مجھے ساتھ لے جائیں۔

''روبی! میرے سامنے بھی یہی بات تھی جو ایک مسئلے سے کم نہیں۔ اپنے عزیز میں چھوڑ چکا ہوں۔ ہوسٹل میں تمھیں رکھنا نہیں چاہتا۔ میرے ایک دیرینہ دوست ریاست راجگڑھ کے نواب ہیں—''

میں نے کچھ کہنے کو لب کھولے لیکن انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''نواب صاحب کی دو بیویاں ہیں اور خدا رکھے وہ دونوں صاحب اولاد ہیں

بہت شریف گھرانا ہے وہ تمھیں اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار کریں گے۔عزیزم! تمھیں کیا نصیحت کروں۔ تم سمجھدار ہو۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ اس سے تمھارے باپ یا سرپرست کی عزت یا وقار کو دھکا نہیں لگتا۔ وہاں کا ماحول اپنے گھر سے قطعی مختلف ہوگا۔ ماحول کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا۔ بلکہ خود بدل جانا، اُن لوگوں کی نگاہ پہچاننا اور ایک سعادتمند بیٹی کی طرح رہنا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری توقعات ضرور پوری کرو گی۔''

''پاپا! میں اپنی جان دے کر بھی آپ کے اعتبار اور وقار کو قائم رکھوں گی۔''

''مجھے یہی امید تھی۔ اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دینا۔ میں ہر مہینے تمھیں خط بھیجتا رہوں گا۔ ہر ہفتہ مجھے خط لکھنا اور—'' ان کی آواز بھرا گئی۔ دیر تک مجھے گلے لگا کر پیار سے نصیحتیں کرتے رہے اور میں روتی رہی۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا۔

آٹھ دن بعد پاپا کا جہاز جانے والا تھا۔ دل نامعلوم کیوں ڈوبتا ہی جاتا تھا۔ گھر کی ہر شے مغموم تھی۔ ماحول سسک رہا تھا۔ جس روز پاپا جانے والے تھے۔ میں بھی اپنے بوڑھی آیا خوش قدم بوا کے ساتھ راج گڑھ جارہی تھی آٹھ دن پلک جھپکتے گذر گئے۔

''پاپا! آپ سچ مچ جارہے ہیں؟'' میں نے سسکیوں پر قابو پا کر کہا۔

انھوں نے جھک کر میری پیشانی چوم لی۔ میرے رکے ہوئے آنسو تار بن کر بہنے لگے۔

''روبی! رخصت کے وقت رویا نہیں کرتے۔ بدشگونی ہوتی ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو سہم گئے۔

جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پاپا نے مڑ کر دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں کار کا سہارا نہ لے لیتی تو ضرور گر پڑتی۔ جہاز آہستہ آہستہ نظروں سے دور ہوتا گیا۔ لیکن میں نے انتہائی ضبط سے آنسو نہ گرنے دیئے۔ پاپا کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے''— بدشگونی ہوتی ہے—''

جب جہاز نظروں سے اوجھل ہونے لگا تو مجھ میں دیکھنے کی ہمت نہ رہی۔ میری

آنکھیں بند ہوگئیں اور خود بخود دو آنسو گر پڑے۔

شام کو ۴ بجے میں اور بوا ٹرین میں سوار ہونے والے تھے۔ میری عزیز دوست ناز میرے پاس تھی۔ گھر کی ہر شے بند کر دی گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی ناز کے گھر سے آیا۔

ہمیں رخصت کرنے بہت سے لوگ آئے۔ جب گاڑی میں حرکت ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے دل ڈوب گیا ہو۔

پورا کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ نوحہ کن خاموشی کو انجن کی بے ہنگم آواز توڑ رہی تھی۔ گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر ٹھہرتی رہی۔ رات ۸ بجے کے قریب ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان شخص تھا۔ جس نے بمشکل اسے سوار کرایا۔ نو وارد لڑکی بیماری کی وجہ سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس کے قدم بُری طرح ڈگمگا رہے تھے۔ اُسے سیٹ پر بٹھا کر نوجوان قلی کو جلدی بستر لانے کے لیے آوازیں دینے لگا۔ لڑکی کی آنکھیں بند تھیں اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات تھے۔

میں نے بوا کی طرف دیکھا وہ قریباً سو چکی تھی۔ اسے جگانا مناسب نہ سمجھ کر میں جلدی سے اٹھی اور اس لڑکی کو بمشکل سہارا دے کر اپنے بستر تک لا کر لٹا سکی۔ اس پر بے ہوشی طاری تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ جو جل رہی تھی۔ میں اُسے کمبل اُڑھا رہی تھی کہ وہی شخص آ گیا۔

''لالہ—''

اس کی خالی جگہ دیکھ کر وہ چلایا۔ لیکن وہ فوراً ہی اسے لیٹے دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

''شکریہ''۔ وہ میرے قریب آ گئے۔ ''نامعلوم قلی کم بخت کہاں چلا گیا ہے۔ ہم دونوں کے بستر اس کے پاس ہیں۔''

میں خاموش رہی اور وہ دوبارہ سامان کا پتہ کرنے چلے گئے۔

بوا اٹھ بیٹھی۔ میرے سب کچھ بتانے پر اس نے مریضہ کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ میں بھی سر دبانے لگی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔ لیکن کچھ سنائی نہ دیا۔

آخر بمشکل ایک لفظ سمجھ سکی۔

''پانی''۔

بوا نے جلدی سے تھرموس میں سے پانی پلا دیا۔ میں نے سہارا دے کر پانی پلایا۔ پانی پی کر جیسے اس میں جان آ گئی۔

''بھیا— بھیا!'' اس نے ایک دو بار کہا۔

''آپ کے بھیا ابھی آ جائیں گے۔'' میں نے تسلی دی۔

''آپ کون ہیں؟''

''اپنا تیمار دار سمجھ لیجئے۔''

وسل ہوئی تو وہ نوجوان پھر آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک قلی تھا جس کے سر پر دو بڑے بڑے بکس اور ایک اٹیچی تھا۔ نوجوان کے اپنے ہاتھ میں ایک نازک سی دواؤں سے بھری ہوئی ٹوکری تھی۔ میری مدد سے انھوں نے دوا پلائی۔ چند منٹ بعد لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔

''لالہ! اب طبیعت کیسی ہے؟'' اس کا بھائی اس کے پاس آ بیٹھا۔

''اچھی ہوں بھیا!''

''ہمارے بستر لے کر قلی بھاگ گیا ہے۔ میں نے تمام قلی دیکھے ہیں لیکن پہچان نہیں سکا۔ دراصل افراتفری میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ بستر اٹھانے والا قلی تھا بھی یا نہیں''۔ وہ بڑی خوش دلی سے مسکرائے۔

''شکر ہے باقی سامان بک کرادیا ہے ورنہ وہ بھی جاتا۔'' لالہ ہنسی۔

''دیکھئے آپ کو بستر کی ضرورت تو ہوگی''۔ انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک تکیہ اور کمبل لالہ کے پاس رہنے دیں۔ ہمارا باقی سامان مال گاڑی سے جارہا ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔''

''نہیں! نہیں! تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے میرے پاس اور بستر ہے۔''

''اچھا تو یہ سفری بستر ہے۔'' لالہ بولی۔

''کسی حد تک۔''

''پچھلے اسٹیشن کی حد تک اور اب یہ بیمار کا بستر ہے۔'' بوا کے ساتھ مل کر وہ میرا بستر کھولنے لگے۔

''کہاں تک ساتھ رہئے گا؟'' لالہ مسکرائی۔

''میں راجگڑھ اُتروں گی۔''

''بھیا بھی وہاں ریاست کے ڈاکٹر ہو کر جارہے ہیں مجھے راستے میں ٹائیفائڈ ہوگیا تھا۔ پچھلے اسٹیشن پر آٹھ دن پڑے رہے۔ آج آخر راجگڑھ پہنچنے کی ٹھانی۔ آپ کا قیام کہاں ہوگا؟''

''میں وہاں کے نواب صاحب کے ہاں جارہی ہوں۔''

''نواب فلک رفعت کے ہاں—'' وہ نوجوان بولے۔

''جی ہاں!''

''کیا وہ آپ کے عزیز ہیں؟''

''جی نہیں—— وہ پاپا کے دیرینہ دوست ہیں۔'' اور میں نے اپنے وہاں جانے کی وجہ بتا دی

''آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔'' لالہ بولی۔

''مجھے روبی مرزا کہا جاتا ہے۔''

''میرا پورا نام گُل لالہ ہے۔ مگر صرف لالہ کہا جاتا ہے۔ یہ میرے بھائی ڈاکٹر اسلم ہیں جنہوں نے حال ہی میں ایم۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔''

''اور سب سے پہلی مریض میری بہن ہیں۔'' اسلم بستر کھول کر بولے۔

بوا نے اسلم کے لیے بستر لگا دیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو یہ رات میں لالہ کے پاس ہی گذار دوں۔ دراصل میں اسے اس حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' وہ سرنج میں دوا بھرتے ہوئے بولے۔

''ضرور'' میں نے جواب دیا۔

بوا نے میرا بستر اوپر کی برتھ پر بچھا دیا اور میں اوپر چڑھ کر لیٹ گئی۔ دو ایک بار آنکھ کھلی تو اسلم کو بدستور لالہ کے پاس بیٹھے پایا۔

صبح لالہ کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی۔ اسلم ہمارے لیے ناشتہ لے آئے۔

خدا خدا کر کے ایک بجے کے قریب راجگڑھ پہنچے۔ پاپا نواب صاحب کو تار دے چکے تھے۔ اسلم اور لالہ کو لینے ہسپتال کی کار آئی تھی۔ جس پر ریاست کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ انھوں نے ساتھ لے جا کر پہنچانے پر اصرار کیا۔ مگر میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

''اچھا لالہ! خدا حافظ''۔ میں نے کہا۔

''خدا حافظ— پھر ملوں گی۔'' انھوں نے کہا اور چلے گئے۔

بوا نے تمام سامان پلیٹ فارم پر رکھوا دیا۔ میں حیران پریشان کھڑی تھی۔ چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ جو جلدی ہی خالی ہوگیا۔ گاڑی وہاں سے آگے نہیں جاتی تھی۔ بوا نے تمام سامان باہر پلیٹ فارم پر رکھوا دیا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہواؤں میں خشکی بڑھ رہی تھی۔ میں گھبرا رہی تھی کہ اگر بارش شروع ہوگئی تو کیا ہوگا۔ ہمارا تو وہاں کوئی واقف بھی نہ تھا۔ مجھے غصّہ آنے لگا۔ آخر تار جو دیا تھا۔ پھر بھی کوئی لینے نہ آیا۔

''بیٹا! کوٹ پہن لو۔ سردی بڑھ رہی ہے۔'' بوا نے کہا۔

''مگر بوا ہمیں کوئی لینے کیوں نہیں آیا؟'' میں نے روکھی آواز میں کہا۔

''شاید ہمارا تار ہی نہ ملا ہو۔''

''بوا! یہاں سے تار کا جواب جا چکا ہے۔''

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ شاید کوئی نظر آجائے۔ اچانک ایک سُرخ و سپید نوجوان سیاہ لمبا کوٹ پہنے تیزی سے پلیٹ فارم پر آ کر ٹرین جواب قریباً خالی ہو چکی تھی جھانکنے لگا۔ میں مایوس ہونے لگی۔ نواب صاحب کے گھر سے تو کوئی انگرکھا، چوڑی دار پاجامہ اور دو پلی ٹوپی پہنے آئے گا۔

نو وارد ہمارے قریب آ کر ذرا رُکا لیکن پھر آگے گذر گیا۔ اور تیزی سے باہر چلا

گیا۔ اِکا دُکا بوندیں گرنی شروع ہوگئیں۔

''چلو بیٹا! کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔'' بوا نے مشورہ دیا۔

میں گارڈ کے پاس گئی۔

''کیوں صاحب! نواب فلک رفعت کی حویلی تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے؟''

''آپ جناب ممتاز مرزا کی صاحبزادی ہیں؟''

''جی ہاں!''

''وہ میرے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ کو ان کے ساتھ دیکھا تھا۔ مگر آپ یہاں کیسے؟''

میں نے مختصراً وجہ بتا دی۔

''ابھی ابھی حویلی سے گاڑی تو آئی تھی مگر چلی گی——''

''پھر اب کیا کیا جائے؟''

''چلیے میں آپ کو پہنچائے دیتا ہوں۔''

''شکریہ!''

''کب پہنچیں گے ہم؟'' راستہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔

''ذرا دیر لگے گی حویلی پانچ کوس پر ہے۔''

تین بجے ہم ایک وسیع مگر خوبصورت حویلی کے بند گیٹ پر جا کر رُکے۔ میں نے اپنے رہبر کا شکریہ ادا کر کے رخصت کر دیا۔ اور خود اندر داخل ہوئی۔ اتنا وسیع بالکل خاموش تھا۔ وہاں ٹینس اور بیڈمنٹن کے کورٹ دیکھ کر مجھے انتہائی تعجب ہوا۔

مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی چپراسی آگے بڑھا۔

''کیا یہ نواب فلک رفعت کا دولت خانہ ہے؟'' بوا نے پوچھا۔

''جی ہاں!''

''تو نواب صاحب سے جا کر کہو سر محمد ممتاز مرزا کی صاحبزادی آئی ہیں۔'' بوا نے پھر کہا۔

چپراسی نے فوراً باقی نوکروں کو میرا سامان اندر لے جانے کو کہا۔

''بڑے سرکار نے صاحب زادہ منصور کو گاڑی دے کر بھیجا تھا۔ مگر وہ لوٹ آئے کیونکہ آپ نہ مل سکی تھیں۔'' چپراسی یہ کہہ کر نواب صاحب کو اطلاع دینے چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ خود بہ نفس نفیس تشریف لے آئے۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔

''جیتی رہو۔''

وہ کچھ دیر مجھے بغور دیکھ کر بولے۔ ''اتنی بڑی ہوگئی ہے میری بیٹی۔ اتنی سی تھی جب بھابی کی گود میں دیکھا تھا۔'' پھر اچانک چپراسی سے مخاطب ہوئے۔ ''ذرا منصور کو میرے پاس بھیجنا۔''

میں نواب صاحب کے ساتھ ایک خوبصورت وسیع ہال میں آ گئی۔

''میں نے منصور کو گاڑی دے کر بھیجا تھا۔ مگر وہ واپس آ گیا۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔'' وہ پیار سے بولے۔

''جی نہیں۔'' ان کے پیار کو دیکھ کر ہاں کہنے کو جی نہ چاہا۔

''کیا نام ہے بیٹا تمھارا؟''

''روبی!''

''تو روبی بیٹا! مجھے یقین نہیں آتا کہ ممتاز تمھیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اُسے تو تمھارے بغیر چین نہیں آیا کرتا تھا۔ کئی بار آنے کو لکھا۔ ہر دفعہ یہی عذر کیا کہ بچی کو چھوڑ کر کیسے آ جاؤں۔ لاکھ بار کہا۔ بھئی بچی کو ساتھ لے آؤ۔ مگر کہتے چھوٹی ہے تکلیف ہوگی۔ شکار جیسی عادت کو اُنھوں نے تم پر قربان کر دیا۔ اب نا معلوم کیسے اتنی دیر کے لیے چھوڑ گیا ہے۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن آنسوؤں نے میری قوتِ گویائی سلب کر لی۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نواب صاحب میرے پاس آ بیٹھے۔

''بیٹا! تم مجھے ممتاز کی جگہ سمجھو۔ انشاء اللہ کبھی محسوس نہ ہونے دوں گا کہ تم اپنے

باپ کے گھر میں نہیں ہو۔'' ان کے پیار میں وہی خلوص تھا جو پاپا کے پیار میں تھا۔

باہر کا دروازہ کھلا۔

''میں اندر آ جاؤں؟''

''ہوں۔'' نواب صاحب بھاری آواز میں بولے۔

ارے یہ وہی شخص تھا جسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا۔

''عزیزم! تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے گاڑی اچھی طرح دیکھی ہے لیکن صاحبزادی تو آ گئی ہے۔''

''ابا حضور! میں شرمندہ ہوں۔ انھیں تو میں نے وہاں دیکھا تھا۔ مگر آپ نے فرمایا تھا ممتاز چچا کی بچی آ رہی ہے۔ میرے دماغ میں دو چار برس کی بچی تھی۔'' وہ سر جھکا کر بولے۔

''بہر حال روبی بیٹا! میں بہت شرمندہ ہوں کہ تمھیں اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ غلطی میری ہے ممتاز کی بیٹی کو لینے مجھے خود جانا چاہئے تھا۔ مگر یہ کم بخت نزلہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔''

''میں معذرت خواہ ہوں ابا حضور!''

''خیر جاؤ مگر آئندہ احتیاط رکھنا۔ اسی لیے میں نے ارشد یا ظفر کو نہیں بھیجا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی شرارت کریں گے۔''

وہ جانے کے لیے مُڑے۔

''ٹھہرو— تمھارا تعارف کرادوں۔'' وہ فرمانے لگے— ''یہ ممتاز کی صاحبزادی روبی ہے۔ اور یہ میرا لڑکا منصور ہے۔''

میں نے سادگی سے سلام کیا۔ جلد ہی مجھے میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

ایک وسیع کمرہ ہر شے سے مزیّن تھا۔ درمیان میں پارٹیشن کرکے بڑی خوبصورتی سے ڈریسنگ روم بنایا گیا تھا۔ پلنگ چھوٹا سا تھا۔ میز پر چند کھلونے پڑے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ یہ لوگ مجھے بالکل بچہ سمجھ رہے تھے۔ ساتھ ہی غسل خانہ اور بوا

کا کمرہ تھا۔ بوا سامان رکھوانے لگی۔ اور میں نہانے چلی گئی۔ بال سنوار رہی تھی کہ چائے آ گئی۔ کچھ دیر بعد نواب صاحب تشریف لے آئے۔ اور مجھے اندر لے گئے۔

نوکروں کے چہروں سے یہ بات صاف عیاں تھی کہ پہلے اس گھر میں کوئی ایسا مہمان نہیں آیا، اور نواب صاحب کی مہربانی اور توجہ کسی حد تک غیر معمولی تھی۔ سب نے مجھے جھک کر سلام کیا۔

حویلی کا اندرونی حصہ قدیم طریقہ پر سجایا گیا تھا۔ بڑے بڑے دیوان بچھے تھے۔ ان پر گاؤ تکیے تھے۔ بیگمات بیٹھی تھیں۔ نواب صاحب کے اعزاز میں بیگمات اور مغلانیاں کھڑی ہوگئیں۔ نواب صاحب نے مغلانی کو سب کو بلانے کو کہا۔ میں نے مؤدبانہ سلام کیا۔ انھوں نے دعائیں دیں۔

چند لمحات کے بعد کچھ لڑکیاں آ گئیں کچھ مجھ سے بڑی تھیں کچھ ہمعصر اور کچھ چھوٹی — میں نے سب کو مشترکہ سلام کیا۔ کچھ خوشی ہوئی کہ وقت گذرے گا۔ نواب صاحب نے سب کا تعارف کرایا۔ اگرچہ گھرانہ خالص نوابی تھا۔ لیکن لڑکیوں کے لباس خاصے جدید تھے۔

''اور وہ ارشد وغیرہ نہیں آئے؟'' انھوں نے فرمایا۔

بیگمات تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ مگر انھوں نے مغلانی کو بھیج کر سب کو بلا لیا۔

''روبی بیٹا! یہ میرے لڑکے ہیں۔ منصور سب سے بڑے ہیں۔ یہ ارشد ہے یہ ظفر یہ مسعود اور یہ نسیم ہے۔ اور یہ میرے عزیز دوست کی نورِنظر روبی ہے۔''

مجھے ایک بار پھر سلام کرنا پڑا۔

نواب صاحب کے ساتھ ہی ان کے صاحب زادے بھی باہر چلے گئے۔ میں بیگمات اور نئی سہیلیوں سے باتیں کرتی رہی۔ وہ ماحول میرے لیے قطعی غیر مانوس تھا۔ میری ذات میرا لباس ہر شے ان کے لیے دل چسپی کا باعث تھی۔ میں شروع سے تعلیم یافتہ اور Advanced لوگوں میں رہی تھی۔ اس گھر میں تمام نوابی روایات موجود تھیں۔

لیکن صاحب زادوں کو تعلیم دلوانے کی وجہ سے یہ گھرانا باہر کی دنیا اور فیشن سے قطعی بے بہرہ نہ تھا۔ منصور اور ظفر تو انگلینڈ تک ہو آئے تھے۔

چھوٹی بیگم جسے سب رانی ماں کہتے تھے مجھ پر بہت مہربان ہوگئیں۔ رضیہ آپا بھی بڑے پیار سے باتیں کرتی رہیں۔ آٹھ بجے کے قریب میں معذرت کر کے سونے کے لیے اٹھی۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ کچھ تکان بھی تھی۔ میرے ساتھ ہی سب اٹھے۔ رانی ماں نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔

میں کمرے میں آئی۔ تو بوا مغلانیوں سے مل کر بڑا پلنگ اور مسہری بچھا چکی تھی۔ میرے کمرے کے ساتھ کھانے والا کمرہ تھا۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔ ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

''رانی ماں! آپ نے دیکھا روبی کا کس بلا کا حسن ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ کسی انسان کی اولاد ہے۔'' رضیہ آپا کی آواز سنائی دی۔

''کیوں نہ ہو باپ مغل ہیں ماں پٹھان تھیں۔ دونوں سے ورثہ میں حسن ہی تو ملا ہے۔''

''اے بیگم صاحبہ! کیا بتاؤں جب چائے دینے گئی ہوں تو وہ بال بنا رہی تھیں۔ میں تو دیکھتے ہی رہ گئی چپہ چپہ بھر تو پلکیں ہیں۔'' مغلانی کہہ رہی تھی۔

''لیکن آزادی بہت ہے۔ بھلا چودہ پندرہ سال کی تو ہوگی۔ لیکن برقعہ تک نہیں پہنتی۔ جب نواب صاحب نے منصور اور ارشد کو بلوایا۔ تو میرے تو حواس گم ہوگئے۔ بھلا اس گھر میں اتنی آزادی کیسے ہوسکتی ہے۔'' بڑی اماں کہہ رہی تھیں۔

''اماں بی! اپنا اپنا دستور ہے وہ شروع سے ایسے ماحول میں رہی ہے۔ لیکن شرافت برقعہ کا نام نہیں ہے۔ جتنی دیر بیٹھی رہی۔ سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دیا۔ نہ ہی نظر اٹھا کر کسی کو دیکھا ہے۔'' آپا رضیہ کی پُرخلوص آواز تھی۔

''تعلیم اور تربیت اگر اعلیٰ پیمانہ پر ہو تو انسان کے کردار کو بہت بلند کر دیتی ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی روبی شرافت اور تہذیب کا مجسّمہ ہے۔'' منصور حسب معمول

سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

''رانی ماں! مجھے تو لطف آ گیا جب ہمارا تعارف ہوا ہے۔ بڑی اماں کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ لیکن خدا گواہ ہے مجھے ابا حضور سے یہ اُمید نہ تھی۔'' ارشد بولے۔

''یہ تو نہ کہو ابا حضور تو بہت آزادی پسند ہیں۔ لیکن ذرا بڑی اماں—'' شاید ظفر بول رہے تھے

''بڑی اماں یہ آزادی ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔'' بڑی اماں تحکمانہ لہجے میں بولیں۔

''مگر برداشت تو کرلی۔'' ارشد شرارت سے بولے۔

''وہ تو صرف اس بچی کی شرافت کی وجہ سے اور دوسرے خود نواب صاحب اس کا کتنا خیال کر رہے ہیں اس لیے بڑی اماں نے جواب دیا۔

''ہمیں بہت نصیحتیں کیں ہیں ابا حضور نے۔ کہہ رہے تھے کہ روبی ممتاز کی بیٹی نہیں میری بیٹی بن کر یہاں رہے گی۔''

اس گفتگو سے میری نیند کافور ہوگئی۔ دل پر بوجھ بڑھ گیا۔ کاش پاپا مجھے بلالیں۔ آہستہ آہستہ میرے آنسو بہنے لگے۔ اس ماحول میں پردے کو کتنی اہمیت تھی۔ لیکن پاپا اس ظاہری پردے کے خلاف تھے۔ ہمیشہ کہا کرتے پردہ دل کا ہونا چاہیئے۔ مگر اب میں کیا کروں۔ کیا برقعہ پہننا شروع کردوں۔ اچانک مجھے پاپا کے الفاظ یاد آ گئے۔

''ماحول کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ خود بدل جانا۔''

یوں لگا جیسے تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔ جلد ہی پردہ شروع کردوں گی۔'' میں نے مصمم ارادہ کرلیا۔ نامعلوم کب ان ہی خیالات میں بھٹکتے ہوئے مجھے نیند آ گئی۔

چند روز یونہی گذر گئے۔ وہاں سب میری عزت کرتے تھے۔ میں بھی ہر حرکت میں محتاط تھی۔ لیکن میری ہر بات ان کے لیے نئی اور غیر معمولی تھی۔ رانی ماں میری عادات کی بہت تعریف کرتیں۔ لیکن بڑی ماں کے تیور اکثر بدل جاتے تھے۔ پھر بھی میں ان کی انتہائی عزت کرتی۔ لیکن ایک دم بدل کر ان کے جیسا بن جانا بھی میرے بس میں نہ تھا۔

نواب صاحب اتنا پیار کرتے۔ اتنے اصرار سے ہر چیز کھلاتے کہ میرا دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ میں صبح شام سیر کی عادی تھی۔ لیکن میں نے اپنی سب عادتیں بدلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ گرمیوں میں پہاڑ پر جا کر Riding ہوتی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا پاپا اکثر انھیں اپنے اور میرے مشغلے لکھتے رہتے تھے۔ جب ہی تو نواب صاحب میری ہر عادت سے واقف تھے۔

ایک دن صبح ہی صبح نواب صاحب تشریف لے آئے۔ میں نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔ جلدی سے اٹھی اور سلام کیا۔

''جیتی رہو'' وہ مسکرائے۔ ''چلو سیر کو چلتے ہیں۔''

''مگر— وہ— لیکن آپ کو تکلیف ہوگی۔ کچھ ایسی ضرورت بھی تو نہیں ہے سیر کی۔''

''میں جانتا ہوں یہ ماحول تمھارے لیے اجنبی ہے۔ تمہاری عادات یہاں کے رہنے والوں سے مختلف ہیں۔ لیکن مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں تمھیں خوش نہیں رکھ سکتا۔'' انھوں نے فرمایا۔

''کیا خوشی صرف سیروں میں مضمر ہے—؟ نواب صاحب! مجھے آپ نے بیٹی کہا ہے تو مجھے وہی عادتیں اپنانے دیجئے جو آپ کی صاحب زادیوں میں ہیں۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ میں آپ سب کو خوش رکھ سکوں۔ آپ کی خدمت کرسکوں۔ اور آپ کے وقار کو قائم رکھ سکوں۔'' میں نے مؤدبانہ کہا۔

''ممتاز کی بیٹی سے مجھے اسی سعادت مندی کی اُمید تھی۔ میں اصرار نہیں کرتا جیسی تمہاری مرضی— لیکن یہ تم نے مجھے نواب صاحب کیوں کہا۔ کیا تم ممتاز کو بھی یہی کہتی ہو؟''

''جی نہیں انھیں تو پاپا کہتی ہوں۔''

''تو مجھے بھی پاپا کہا کرو۔''

''ابا حضور نہ کہا کروں—؟'' میں کوئی نئی بات نہ کرنا چاہتی تھی۔

''ضرور کہا کرو— تمھارے منہ سے یہ بڑا اچھا لگتا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے چلے

گئے۔

ابھی میں دروازے میں ہی کھڑی تھی کہ رضیہ آپا اور میمونہ آ گئیں۔

''صبح بخیر!'' میں نے ان کا خیر مقدم کیا۔

''صبح بخیر؟ وہ مسکرائیں۔''چلو ذرا صحن میں گھومتے ہیں۔''

اتنا وسیع صحن تھا کہ خاصی سیر ہوسکتی تھی۔ باہر لان میں جانا وہاں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اندر بھی ایک طرف چھوٹا باغ تھا۔ جس کے درمیان میں فوارہ تھا۔ بادام کے پودے گلاں پھولوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایک طرف جھولا پڑا تھا۔ ساتھ ہی اندرونی لان تھا۔ جس کے چاروں طرف باڑتھی۔

''ابا حضور کہہ رہے تھے یہاں بیڈمنٹن کا انتظام کردیں گے۔ باہر کے لان میں تو ہم جانہیں سکتے۔'' آپا رضیہ نے کہا۔ تمھیں تو کھیلنا آتا ہوگا؟''

''جی ہاں! تھوڑا سا۔'' بیڈمنٹن تو میں بچپن سے کھیلتی تھی۔ شروع میں پاپا مجھے خوش کرنے کو ہار جایا کرتے تھے۔ لیکن اب تو کبھی کبھی انھیں سچ مچ ہرا دیتی تھی۔ لیکن ان دنوں اسکول میں ٹینس کا زور تھا اور میں اور ناز مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔

''تو ہمیں سکھا دو گی نا؟''

''ضرور''

سامنے سے نواب صاحب تشریف لاتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ منصور، ارشد اور ظفر بھائی تھے۔ ارشد بھائی چونے کی بالٹی اٹھائے ہوئے تھے۔ منصور بھائی ٹینٹ اور ظفر ریکٹ وغیرہ۔

''اچھا تو ارشد! شروع کرو— اور وہ نسیم کہاں ہے؟'' نواب صاحب نے فرمایا۔

''تو کیا کورٹ ارشد بھائی بنائیں گے؟'' آپا بولیں۔

''ہاں تم جاؤ اور نسیم کو بلا لاؤ۔''

منصور بھائی اور ظفر بھائی کورٹ ناپ کرنشان لگانے لگے۔

میں تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس روز مجھے اسکول داخل ہونا تھا۔ گھر میں سوائے ننھی میمونہ اور نصرت کے اور کوئی اسکول نہ جاتا تھا۔ ان کے ساتھ مغلانی جاتی تھی۔ میرے ساتھ بوا کا جانا قرار پایا۔ گھر کی فٹن ہمیں چھوڑنے گئی۔ میرے داخلے کے لیے پہلے نواب صاحب ہیڈ مسٹرس کو لکھ چکے تھے۔ میں نے مائی سے اطلاع دینے کو کہا۔ جلد ہی مجھے اندر بلا لیا گیا۔

اندر داخل ہو کر میں نے ہیڈ مسٹرس (مس ملوری) کو سلام کیا۔

''آیئے۔'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ یہاں داخل ہونے آئی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کون سی کلاس میں؟''

''جی دسویں میں۔''

''خوب— آپ غالباً نواب صاحب کی صاحب زادی نہیں ہیں؟''

''جی ہاں میں ان کے دوست کی لڑکی ہوں۔'' وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھیں۔

''آپ سر محمد ممتاز مرزا کی صاحب زادی تو نہیں ہیں؟''

''جی ہاں— مگر......؟''

''ناممکن تھا کہ میں اقبال کی بیٹی کو نہ پہچانوں۔''

''کیا آپ ممی کو جانتی ہیں؟''

''ہاں—'' انھوں نے گہرا سانس لیا۔ ''جتنا میں جانتی ہوں شاید اور کوئی نہیں جانتا۔ ہمارا پیار تو تمام اسکول میں مشہور تھا۔ کالج میں بھی ساتھ رہا۔ کاش وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لیتیں۔''

''میرا دل بھر آیا۔ کاش ممی زندہ رہتیں!

مس ملوری بہت اعلیٰ کردار کی مالک تھیں۔ انھوں نے اسکول کا کام جدید طریقے پر چلایا تھا اسکول اگرچہ گورنمنٹ تھا۔ لیکن ریاست سے بھی مدد ملتی تھی۔ طالبات

زیادہ نہ تھیں۔ ریاست کے لوگ تعلیم کے خواہاں تھے۔ لیکن خود نواب صاحب تعلیم کو بہت پسند کرتے تھے یہ دوسری بات تھی کہ وہ خاندانی روایات کو مکمل طور پر توڑ کر صاحبزادیوں کو تعلیم نہ دلوا سکتے تھے۔ لیکن نئی پود میمونہ اور نصرت کو صاحبزادے خود اصرار کر کے پڑھوا رہے تھے۔ میرا معاملہ ہی الگ تھا۔

میں اسکول میں گھل مل گئی پورا اسٹاف مجھ پر مہربان ہوگیا۔ مس ملوری ہر بات میں میرا مشورہ لیتیں۔ میمونہ اور نصرت کو پہلے ہی چھٹی ہوجاتی تھی۔ لیکن وہ میرے انتظار میں بیٹھی رہتیں۔ میمونہ مجھ سے بہت مانوس تھی۔ ہر بات میں میری تقلید کرنا اسے بہت پسند تھا۔ اکثر میرے کمرے میں بیٹھی معصومیت سے باتیں کرتی رہتی۔

ایک سہ پہر کو میں پڑھ کر لیٹی ہی تھی کہ وہ اُچھلتی کودتی آ گئی۔

''روبی باجی! سو رہی ہیں آپ؟''

''ہاں!''

اور وہ زور سے ہنس پڑی۔

''کیا بات ہے؟''

''باجی! آپ کو سینا آتا ہے؟''

''ہوں۔''

''تو میرا یہ فراک ایسا سی دیجئے جیسا آپ کے شہروں میں پہنا جاتا ہے۔''

یہ بات سن کر میں حیران رہ گئی۔

''یہ کپڑا کیسے لائی؟''

''رانی ماں نے دیا ہے۔''

''اچھا لاؤ میں سی دیتی ہوں۔''

وہ خوش ہوگئی۔

مغرب کی نماز تک بمشکل فراک ختم ہوسکا۔ صبح میمونہ اسکول جانے کے لیے میرے کمرے میں آئی۔ میں قریباً تیار ہوچکی تھی۔ اس نے نیا فراک پہنا۔ میرے پاس

اسی رنگ کے ربن تھے وہ بھی باندھ دیئے۔

تیار ہوتے ہی ایک دم وہ باہر بھاگ گئی۔

میں نے کتابیں بوا کو دیں اور برقعہ لے کر صحن میں آ گئی۔ سامنے سے میمونہ آ گئی۔

''باجی!''

''ہوں۔''

''شکریہ!'' وہ شرما کر بولی۔

''یہ کہاں سے سیکھا؟''

''سب نے میرا فراک بہت پسند کیا ہے۔ رانی ماں کہہ رہی تھیں تم بھی باجی کی طرح بننا۔ منصور بھیا کہنے لگے۔ ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ میں نے کہا نہیں تو انھوں نے ڈانٹا کہ جاؤ شکریہ ادا کر کے آؤ۔''

''ہاں میمونہ! جب کوئی بڑا کام کر کے دے تو ضرور شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

اسکول میں وقت بہت دل چسپی سے کٹتا۔ اسی روز مجھے اسکول یونین کا پریذیڈنٹ چُنا گیا۔

گھر آئے تو سب بیٹھے تھے صرف بڑی ماں صحن میں تھیں۔

''آج ہماری باجی کو بڑی بڑی میزوں پر کھڑا کیا گیا۔ اور —'' میمونہ نے الیکشن کی تفصیلات سنانی شروع کیں۔

''اور — میز پر کان پکڑوا کر کھڑا کیا۔'' ارشد بھائی بات کاٹ کر بولے۔

''نہیں تو —'' میمونہ نے سر ہلایا۔ ''اتنی تالیاں بجی تھیں۔ پھر باجی بولی بھی تو تھیں۔''

''معافی مانگ رہی ہوں گی۔'' ارشد پھر بولے۔

مجھے غصہ آ گیا۔ بھلا انھیں مجھ سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

تم بتاؤ روبی! کیا بات ہوئی تھی؟'' رانی ماں بولیں۔
''جی مجھے اسکول یونین کا پریذیڈنٹ چنا گیا تھا۔''
''رانی ماں! بھلا انھوں نے میز پر کیوں کھڑا کیا اور معافی کیوں منگوائی۔'' ارشد بالواسطہ مجھ سے مخاطب تھے۔
''اسکولوں کالجوں میں انتخابات ہوتے رہتے ہیں جسے منتخب کیا جاتا ہے وہ اسٹیج پر جاکر شکریہ ادا کرتا ہے۔''
''سچ مچ۔'' وہ باز نہ آئے۔ سب ہنس پڑے اور میں کٹ کر رہ گئی۔
ارشد بھائی تو اچھوں اچھوں کو رُلا دیتے تھے۔لیکن مجھ سے انھیں خاص چڑ تھی۔ میں اٹھ کر چلی۔
''دیکھا ارشد! اپنے مذاق کا ردِعمل۔'' منصور بھیا بولے۔
''لیکن بھیا! اس میں چڑنے کی کون سی بات ہے۔''
''ایسے لوگ اپنا قصور کب مانتے ہیں۔''
''روبی! تم ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' رانی ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھے بیٹھتے ہی بن پڑی۔ بڑی ماں آ گئیں۔ ساتھ مغلانی تھی جس نے چند خطوط منصور بھیا کو دیئے۔
''آپ کے خط۔'' انھوں نے دو خط میری طرف بڑھائے۔
ایک پاپا کا خط تھا اور ایک ناز کا۔
پاپا کا اتنا پیارا خط تھا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ ناز نے لکھا تھا۔
''روبی! تم کیا گئیں رونق چلی گئی۔ وہی اسکول ہے وہی رونقیں۔ ایک تم نہیں تو مجھے دوسروں کی ہنسی بھی کھلتی ہے۔کل یہاں مینا بازار تھا۔کوئی ہوگا جسے تمھارے جانے کا رنج نہ تھا۔ بیگم فاروقی کہہ رہی تھیں۔ ہمیں اندازہ ہی نہ تھا کہ اس اسکول کی رونق صرف روبی کے دم سے ہے۔ ہم سب بہت افسردہ تھے۔حتیٰ کہ مس میزینی بھی کہہ رہی تھی کہ روبی کی کمی محسوس نہ کرنا گویا اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔''

خط پڑھ کر میرا دل بہت اداس ہوگیا۔ اپنا گھر۔ اپنا اسکول اور دوست یاد آ گئے۔

''کس کا خط ہے؟'' بڑی ماں نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

''ایک پاپا کا ہے اور دوسرا میری سہیلی کا۔'' میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اُداس ہوگئیں۔'' رانی ماں دلاسے سے بولیں۔

''جی نہیں۔ یونہی اپنا پرانا ماحول یاد آ گیا۔''

میں وہاں سے اٹھ آئی۔ پاپا نے لکھا تھا۔

''جب میں واپس آؤں گا تم ایف۔ اے کرچکی ہوگی پس پڑھائی میں دل لگاؤ۔ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ جو کام بھی سیکھ سکو سیکھ لینا۔ یاد رکھو کوئی کام بھی انسان کی پوزیشن سے گرا ہوا نہیں ہوتا۔''

ایک جگہ لکھا تھا۔

''میرا پارسل تمھیں مل جائے گا۔ اس میں نواب صاحب کے لیے اون ہے تم انھیں سوئٹر بُن کر دینا۔ اگر میرے لیے کوئی نیا سوئٹر بنا ہو تو وہ بھی انھیں دے دینا۔ مجھے بھیجنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمھیں تکلیف ہوگی۔''

ساتھ ایک لفافہ تھا جس پر ان کا پتہ تھا۔ میں نے اسی وقت خط لکھا اور انھیں یقین دلایا کہ میں بہت خوش ہوں۔

اتوار کو چھٹی تھی اسی روز میں نے سوئیٹر مکمل کرلیا۔ ابھی چند ٹانکے ہی رہتے تھے کہ نواب صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے اُٹھ کر خیر مقدم کیا۔ ان کے ہاتھ میں بڑا سا پارسل تھا۔

''روبی بیٹا! یہ پارسل ممتاز نے بھیجا ہے۔ وہ کسی قدر اُداس تھے۔

''جی ہاں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ وہ کچھ چیزیں پارسل سے بھیج رہے ہیں۔''

''ممتاز نے پارسل نہیں بھیجا میرا مذاق اُڑایا ہے۔''

''یہ کیا فرمایا آپ نے؟''

''روبی! کیا تم مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتیں کہ تمہاری ضروریات پوری کرسکوں؟''

''لیکن کیا پاپا مجھے وہاں سے کوئی شے بطور تحفہ بھی نہیں بھیج سکتے؟''

''مجھے چیزوں کا غم نہیں۔ رنج ہے تو اس چیک کا۔'' انھوں نے ایک ہزار کا چیک میری طرف بڑھایا۔

''لیکن یہ تو انھوں نے میرے لیے بھیجا ہے۔''

''روبی! کیا تم مجھے ممتاز کی جگہ نہیں سمجھتی ہو؟''

''ابا حضور! کیا اس کا جواب صرف الفاظ میں دیا جاسکتا ہے؟''

''جب تم ابا حضور کہتی ہو تو سرور آجاتا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''دیکھئے اگر پاپا کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ انھوں نے آپ کو رنج پہنچانے کے لیے ہرگز ایسا نہیں کیا۔''

''یہ تو میں جانتا ہوں۔ مگر بھی مجھے رنج ہے ضرور۔''

''ابا حضور! میں نے آپ کے لیے ایک چیز بنائی ہے۔'' میں نے بات بدلی۔

''کیا بنایا ہے ہماری بیٹی نے؟''

میں نے سوئٹر ان کی طرف بڑھایا۔

اسے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئے جیسے میں نے کوئی نایاب شے دی ہو۔

''بیٹا آج ہے جلسہ، جاتے ہوئے پہنوں گا۔''

''بہت اچھا۔''

''میں نے پارسل کھول کر انھیں سب چیزیں دکھائیں۔ اک البم تھا۔ ایک کوٹ۔ تین بروچ اور اون کا بنڈل۔

''پاپا نے یہ اون آپ کے سوئٹروں کے لیے بھیجی ہے۔''

''میں نے شاید ہی گھر کا بنا ہوا سوئٹر پہنا ہو۔''

''اب میں کبھی بازار کا بُنا ہوا پہننے نہ دوں گی۔''

وہ ہنستے ہوئے چلے گئے۔

شام کو نواب صاحب تیار ہو کر میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے سوئٹر پہنا دیا۔ انھوں نے ایک انگوٹھی دی۔

''یہ کیا ابا حضور؟''

''تمھارا انعام''

میں نے سر جھکا کر سلام کیا اور باہر آ گئی۔

سب کی نظریں نواب صاحب پر مرکوز تھیں۔

''ابا حضور! یہ اتنا خوبصور سوئٹر کہاں سے لیا؟'' ارشد بھائی نے پوچھا۔

''روبی بیٹا نے بُنا ہے۔''

روبی نے — سچ کہو روبی! تم نے خود بنا ہے؟'' آپا رضیہ کو یقین نہ تھا۔

''جی ہاں۔''

''دیکھا رضیہ! تعلیم یافتہ اور ہم لوگوں میں یہ فرق ہے۔'' رانی ماں بولیں۔

''بیگم! اصل فرق یہ ہے کہ ہم لوگ ہر کام کرنا برا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کوئی کام بھی برا نہیں۔'' نواب صاحب نے فرمایا۔

''نوج! اب نوابوں کی لڑکیاں ایسے کام کرتی پھریں۔'' بڑی ماں بولیں۔

''بس اصل فرق اماں نے ظاہر کر دیا ہے۔ کام کرنے سے نواب زادیوں کے سرخاب کے پر جو جھڑ جاتے ہیں نا۔'' ظفر بھائی طنز سے بولے۔

''اصل فرق یہ ہے کہ ہم پُرانی روایات اور رسومات میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ چچا ممتاز بھی تو نوابی خاندان سے ہیں۔'' نسیم بھائی بھی نہ رہ سکے۔

''اصل بات یہ ہے کہ اب دیر ہو رہی ہے۔'' ارشد بھائی مسکرائے اور سب باہر چلے گئے۔

بڑی ماں کی تیوری پر بل پڑ چکے تھے۔ میں اُٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

کوئی کام نہ تھا تو پاپا کے بھیجے ہوئے البم میں تصویریں لگانے لگی۔ ہر تصویر کسی

نہ کسی خوبصورت واقعہ کی یاد تھی۔ میری تقریباً ہر تصویر پر ناز نے الٹے سیدھے ریمارکس لکھے تھے۔ ایک تصویر میں میں نے نہا کر کھلے بالوں سے اتروائی تھی۔ لکھا تھا۔

''زلفوں پہ گھٹاؤں کا دھوکا آنکھوں پہ گماں میخانے کا''

ایک دفعہ ناز سے میری ناراضگی ہوگئی۔ بس یونہی۔ وہ بیٹھی مجھے منا رہی تھی۔ پروین نے اسی طرح تصویر لے لی تھی۔ لکھا تھا۔

''ہمیں غصّے پہ پیار آتا ہے''

ایک تصویر میں سائیکل میرے ہاتھ میں تھی۔ لکھا تھا

''بچ کے چلنا میری سرکار''

ایک رنگین تصویر (جو ناز کی پسندیدہ تھی اور وہ اسے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش بھی کرچکی تھی) لکھا تھا۔

''تری تصویر بھی کہتی ہے صورت ایسی ہوتی ہے''

نہ جانے کیوں میرے آنسو گرنے لگے۔ میں ناز کو لکھے ہوئے خط میں تصویر رکھ کر لفافہ بند کردیا۔

تخیل مجھے ان وادیوں میں لے گیا جو اب مجھ سے دور ہوچکی تھیں۔ نہ جانے کب تصورات میں کھوئی رہتی کی دروازہ کھٹ سے کھلا۔

''روبی! اٹھو چلو ذرا۔'' رضیہ آپا بوکھلائی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا آپی؟''

''تار آیا ہے۔ ذرا پڑھ دو۔'' وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔

میں فوراً ساتھ ہولی۔ بڑی اماں کے تو پسینے چُھٹے جارہے تھے۔ مغلانیاں ہاتھ پاؤں دبا رہی تھیں۔ اور بار بار کہہ رہی تھیں۔ ''الٰہی خیر۔''

رانی ماں کے چہرے کا رنگ بھی قدرے متغیر تھا۔

''ذرا دیکھنا روبی! کیسا تار ہے؟''

میں نے تار لے لیا۔

اماں جی! یہ تار نواب سلیمان صاحب نے دیا ہے اور آپ سب کو اپنی صاحبزادی کی شادی پر بلایا ہے۔''

''الٰہی تیرا شکر ہے۔'' رانی ماں بولیں۔

بڑی ماں فوراً اٹھ بیٹھیں۔

''تاریخ نہیں لکھی؟''

''جی لکھی ہے آج سے بیس دن بعد۔''

بڑی ماں ناراض ہوگئیں۔

''یہ بھائی کا حال ہے بیس دن پہلے بھی کیوں خبر دی۔ ایک دن پہلے بلوایا ہوتا۔''

اور میں حیران تھی کہ آخر بیس دن پہلے بھی تار دے کر بلانے کی ضرورت تھی۔

''اماں جی! شاید یہ تاریخ اچانک مقرر ہوگئی ہو۔'' میں نے عرض کیا۔

''بہرحال اب میں تیاری کیا کروں۔ اتنے دنوں میں کیا ہوسکتا ہے۔ سُنتی ہوں لڑکی کے سسرال والے بہت پڑھے لکھے ہیں۔ ذرا فیشن کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ پھر سب نے یہی پوچھنا ہے پھوپی کیا لائی ہے۔ کسی کو کیا پتہ پھوپی کو بیس دن پہلے اطلاع دی گئی تھی۔

بڑی اماں واقعی پریشان تھیں۔

''اماں جی! اتنے دن ہیں۔ تیاری کا کیا ہے ایک ہفتے میں ہوجائے گی۔''

''بیٹی! تم ذرا ہاتھ بٹاتی رہنا۔''

''آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں میں ہر طرح حاضر ہوں۔''

بڑی اماں کسی قدر مطمئن ہوگئیں۔ مگر اسی وقت تیاریاں شروع ہوگئیں۔

میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

شام کو بیڈمنٹن کھیلنے چلے۔

''بھئی پہلے ان اناڑیوں کو سکھانا پڑے گا۔'' ارشد بھائی بولے۔

ایک ایک کو سکھاتے ہیں۔'' نسیم نے تجویز پیش کی۔

''نہیں پہلے انھیں کھیل کر دکھاتے ہیں۔'' سب کی اپنی اپنی رائے تھی۔

''نہیں انھوں نے ہمیں کھیلتے ہوئے کئی بار جھانکا ہے۔ اب ایک ان میں سے ہو اور ایک ہم میں سے۔'' منصور بھائی نے بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی۔

''اور اس طرح سب کے شاگردوں کا مقابلہ کر کے سکھانے والی کی اُستادی مان لی جائے۔'' ارشد بھائی بولے۔

''اچھا یونہی سہی۔''

سب متفق ہو گئے۔

بھئی میں تو منصور بھیا سے سیکھوں گی۔'' آپی بولیں۔

''اور ہم بھی۔'' فرحت اور فرخندہ نے کہا۔

''یا پھر ہمیں ظفر بھائی سکھا دیں۔ ارشد بھائی ویسے کیا کم تنگ کرتے ہیں جو انھیں چڑانے کا نیا موقع ہم خود دیں۔''

دیکھا ارشد!'' ظفر بھائی مسکرائے۔

''دیکھا ہے صاحب۔'' ارشد ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔'' سب اچھے اچھے لوگ تو منصور بھائی لے گئے۔ اناڑیوں کو سکھا کر تو اُستاد بدنام ہوتے ہیں۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بڑے آئے وہاں سے استاد نامعلوم سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو۔''

''شرط بھی تو تمہاری تھی کہ شاگردوں کا مقابہ کر کے سکھانے والے کی اُستادی مان لی جائے۔''

''ہاں بھائی اپنے کیے کی سزا بھی تو میں ہی بھگت رہا ہوں۔'' وہ مصنوعی فکر مندی سے بولے۔

''ارشد! باز آؤ۔'' منصور بھائی بولے۔

''خوب بھیا! یہ تو وہی معاملہ ہے۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی''

میرا جی چاہا ریکٹ اٹھا کر پھینک دوں۔

''چلیے روبی! آپ کورٹ میں آیئے۔ چلو ارشد! تم دوسر طرف۔'' منصور بھائی نے کہا۔

اور میں ریکٹ تھامے انتہائی ضبط وتحمل سے کام لے کر کورٹ میں آ گئی۔

''آپ کو ریکٹ تو پکڑنا آتا ہوگا؟'' وہ بڑی شرافت سے مسکرائے۔

''جی— نہیں'' میں نے غصّہ ضبط کر کے کہا۔

''اچھا تو ادھر دیکھئے یوں پکڑتے ہیں ریکٹ۔'' انھوں نے سمجھایا۔

میں نے جان بوجھ کر عجیب طرح ریکٹ پکڑ لیا۔

''دیکھا منصور بھیا!'' ارشد بھائی پھر بولے۔ ''بھئی میں اپنی شرط واپس لیتا ہوں انھیں تو قیامت تک نہ سکھا سکوں گا۔''

''استاد وہی ہوتا ہے جو اناڑیوں کو سکھائے۔'' مجھ سے نہ رہا گیا۔

لیکن اناڑیوں کو ریکٹ پکڑنا تو آتا ہی ہوگا۔'' ان کے چہرے پر مخصوص طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اور نظریں آپی کی طرف۔

''بھئی اللہ! ارشد بھائی اب شروع بھی کیجئے گا۔'' فرحت بیزاری سے بولیں۔

''آیئے۔'' انھوں نے جھوٹی آہ بھری۔ ''جو قسمت میں ہے بھگتنا پڑے گا۔''

اُنہوں نے سروس شروع کی۔ پانچ منٹ تک میں نے دانستہ شٹل کاک کو گرنے دیا۔ پھر ایک دم جو کھیلنا شروع کیا آدھ گھنٹہ میں ارشد بھائی کو ہرادیا۔

''کہو ارشد! اب کیا رائے ہے؟'' ظفر بھائی ہنسے۔

''کبھی کبھی اپنی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگانے والوں کو اناڑیوں سے منہ کی کھانی پڑتی ہے۔'' میں نے انتقاماً کہا۔

''ہائے روبی! تم کتنا اچھا کھیلتی ہو میرا تو خوشی سے برا حال ہے۔'' آپا نے مجھے چمٹا لیا۔

''مجھے تو خوشی ہے ارشد بھائی ہار گئے۔'' فرخندہ بولی۔

''بھئی روبی! تم ہمیں بھی سکھا دو۔ پھر ان ہی اُستادوں سے مقابلہ ہوگا۔'' فرحت نے طنزیہ کہا۔

''تم سیکھ چکیں۔'' ارشد بھائی اپنی عادت سے باز تھوڑا آ سکتے تھے۔

''جیسے روبی کو کہہ رہے تھے۔''

''وہ تو جھوٹ بول کر جیتی ہیں۔''

''ارشد! یہ الزام ہے۔''

''اونہہ! الزام ہے سُنا نہیں جب کہہ رہی تھیں کہ ریکٹ پکڑنا بھی نہیں آ تا۔ مجھے یہی خیال رہا کہ شاید سچ ہو۔ اس لیے اچھی طرح کھیلا بھی نہیں۔'' ارشد بھائی شرمندگی مٹانے کو بولے۔

''جی ہاں میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' میں نے پہلی بار انھیں براہ راست مخاطب کیا۔ ''لیکن سچ تو آپ بھی نہ کہہ رہے تھے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ آپا کی طرف دیکھ کر بولے۔ یعنی بالواسطہ مجھ سے خطاب تھا۔

اپنی تعریف میں جو قلابے آپ نے ملائے تھے کیا وہ سب جھوٹ ثابت نہیں ہوگئے'' میں نے پوچھا۔

''پھر کیا ہوا۔ آیئے ایک بار پھر سہی۔'' انھوں نے چیلنج کیا۔

''چلیے!''

ساتھ بڑی اماں آ گئیں۔ ان کے تیور کڑے تھے۔ فرخندہ جھٹ ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور ریکٹ میرے ہاتھ سے گرتا گرتا بچا۔

''بڑی اماں! روبی نے کھیل میں ارشد بھائی کو ہرا دیا ہے۔'' فرخندہ نے جان بوجھ کر بڑے دلار سے کہا۔

''ہوں'' ان کے تیور اور بھی بگڑ گئے۔

''شروع کیجئے۔'' ارشد بھائی میری حالت دیکھ کر شاید مسکرا رہے تھے۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے کھیلنا شروع کیا۔ میری نظریں بار بار بڑی ماں کے چہرے اور فرخندہ کے ہلتے ہوئے لبوں پر جاتی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد ارشد بھائی نے مجھے بری طرح ہرا دیا۔ بڑی ماں کی آنکھوں میں نا معلوم کون سا جذبہ تھا کہ میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہنے لگا۔ میں نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔

''اتنے بڑے کھلاڑی ہار کر رویا نہیں کرتے۔'' ارشد بھائی نے اپنے لہجے کے طنز کو چھپانا بھی نہ چاہا تھا۔

چند منٹ وہاں ٹھہر کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات گئے تک میرے آنسو نہ تھمے۔

آسمان پر گہرے مٹیالے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں خنکی ہر لحظہ بڑھ رہی تھی۔ اِکا دُکا بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ میری آنکھیں کچھ دکھتی تھیں۔ مگر صبح ہسٹری کا ٹیسٹ تھا۔ اس لیے پڑھنا ضروری تھا۔ بستر پر بیٹھتے ہی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ''اب کیا کیا جائے'' میں نے سوچا بغیر پڑھے ٹیسٹ میں پاس ہونا ناممکن تھا۔ آخر لحاف کو ایک طرف پھینکا اور کرسی دریچے کے پاس بچھا کر بیٹھ گئی۔ اس طرح کم از کم نیند آنے کے امکانات کم ہوگئے تھے۔ ابھی ہنری ہشتم کی پہلی طلاق پر پہنچی تھی کہ نیند آ گئی۔ عجب مصیبت ہے یہ نیند بھی۔ میں نے دریچہ کھول دیا۔ سرسراتی شور مچاتی ہوائیں میرے خون کو منجمد کر گئیں۔ ہسٹری کے اوراق گڈمڈ ہوگئے۔ میری زندگی کی طرح۔ پاپا کا جانا۔ اور یہ سرسراتی چیختی چلاتی ہوائیں کتنی مناسبت تھی ان میں۔ میری زندگی کے اوراق بھی گڈ مڈ ہو چکے تھے۔ باوجود کوشش کے ایک لفظ بھی آگے نہ پڑھ سکی۔ راجگڑھ کی سردی ویسے کیا کم تھی جو بارش نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ بارش کے قطرے ہسٹری پر سے ہوئے ہوئے مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ میں اٹھ کر دریچے میں بیٹھ گئی ڈوپٹہ اُڑ کر پلنگ پر جا گرا۔ باہر تاریکی تھی۔ صرف تاریکی۔ بارش تیز ہوگئی۔ میرا لباس بھیگتا جا رہا تھا۔ لیکن وہاں سے ہلنے کو جی نہ چاہا۔ نا معلوم نیند کب آ گئی۔ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے نا۔

صبح سینے میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ میں بمشکل اٹھی اور اسکول کے لیے تیار ہوئی۔ آنکھیں خون کی طرح سُرخ ہورہی تھیں۔

''بیٹا! آج اسکول نہ جاؤ۔

''کیوں بوا؟''

''تمہاری آنکھیں جو دُکھ رہی ہیں۔ تکلیف بڑھ جائے گی۔'' بوا فکرمند تھی۔

''نہیں بوا! آج میرا ٹیسٹ ہے۔ پھر میں نے سیاہ چشمہ جو لگا رکھا ہے۔'' میں نے تسلی دی۔

ناشتے پر سب بیٹھے تھے۔ میرا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں چپ چاپ آپا رضیہ کے پاس بیٹھ گئی۔

''دھوپ تو ہے نہیں اور آپ نے سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔'' فرخندہ حسب معمول طنزیہ لہجے میں بولیں۔

''بھئی فیشن اسی کو کہتے ہیں۔ فیشن دھوپ اور چھاؤں کو تھوڑا دیکھتا ہے۔'' ارشد بھائی بھلا ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے کب جانے کب جانے دیتے تھے۔

جی چاہا چشمہ اٹھا کر ان کے سامنے دے ماروں۔ مگر میں چپ چاپ چائے پیتی رہی۔ میری طبیعت اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ زیادہ دیر بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر اسکول چلی گئی۔

طبیعت کا بھاری پن آخر رنگ لا کر رہا۔ اسکول جاتے ہی سینے کا درد شدت اختیار کر گیا۔ اُردو کا پیریڈ تھا مس حیدر نے مجھے پڑھنے کو کہا۔ کھڑی ہو کر بمشکل دو ایک لفظ پڑھ سکی تھی کہ تیورا کر گری۔ سب نے پکڑ کر لٹا دیا۔ مس حیدر مس طوری کو بلا لائیں۔

''روبی! کیا ہوا؟'' ان کی شفیق آواز میں نے سنی۔

''جی کچھ نہیں۔ ذرا چکر آ گیا تھا۔''

''تمھیں تو اتنا تیز بخار ہے۔ پھر آنکھیں دکھتی ہیں۔ ایسی حالت میں اسکول نہ آنا چاہئے تھا۔''

''مس صاحب! میں نے تو بہت منع کیا پر مانی نہیں کہ آج ٹیسٹ ہے۔'' بوا بوکھلائی کھڑی تھی۔

''مس حیدر! ان کے لیٹنے کا انتظام کیجئے۔''

مجھے مس طوری کے کمرے میں لٹا دیا گیا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھیں۔

''روبی! کیسی طبیعت ہے اب؟''

''شکریہ! اب تو اچھی ہوں۔ میں بمشکل بول سکی۔

تین بجے فٹن آئی۔ میمونہ میرے پاس بیٹھی تھی۔ آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مس طوری میری آنکھوں میں دوا ڈالنے لگیں تو بوا نے فِٹن میں تکئے رکھ دیئے۔

''بوا! مجھے میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' میں نے گھر پہنچ کر کہا۔

میمونہ اور بوا نے سہارا دے کر مجھے بستر پر لٹا دیا۔ اتنی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی کہ سانس تیزی سے چلنے لگا۔

''باجی! روبی باجی!'' میمونہ بہت سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''جی!'' ایک کراہ سی میرے ہونٹوں سے نکلی۔

''ذرا آنکھیں کھولیے۔''

میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا میمونہ؟''

''باجی! آپ کی آنکھیں اتنی سُرخ کیوں ہیں؟'' اس کی آواز بڑی اُداس تھی۔

میں نے اس کا ننھا سا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اور وہ پگلی میرے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ میں نے پیار کرتے ہوئے اسے پانی لانے کو کہا۔

کچھ دیر بعد اس کے ساتھ سب آ گئے۔

''کیا ہوا روبی بیٹا؟'' رانی ماں مجھ پر جھکیں۔

''ٹھیک ہوں رانی ماں! ذرا سا بخار ہو گیا ہے۔''

''میں نے صبح پوچھنا بھی چاہا کہ یہ نگوڑی کالی عینک کیوں لگا رکھی ہے مگر چپکی ہورہی کہ فیشن ہوگا۔'' بڑی اماں نے مزاج پُرسی کی۔

''جی اماں! وہ میری آنکھیں دُکھتی ہیں نا اس لیے۔''

''مگر تمھیں تو بخار ہے روبی!'' آپا رضیہ نے کہا۔

''یہ اچانک بخار کیسے ہوگیا؟ صبح تو ٹھیک تھیں۔'' فرخندہ بولیں۔

''خاک ٹھیک تھیں۔ میں نے خود غور کیا تھا کہ روبی سُست ہے۔'' فرحت نے تردید کی۔

''کیا زیادہ تکلیف ہے؟'' منصور بھائی بولے۔

''جی نہیں۔ بس ذرا سینے میں درد ہے۔''

سینے میں درد کا سُن کر تقریباً سب چونکے۔ بڑی اماں گھبرا کر باہر چلی گئیں۔

رانی ماں! کسی ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ منصور بھائی نے مشورہ دیا۔

''ڈاکٹر آچکا اس گھر میں۔'' ارشد بھائی اپنی مخصوص ہنسی ہنسے۔

مگر سینے کا درد تو خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔'' ظفر بھائی پریشانی سے بولے۔

بڑی اماں نواب صاحب کے ساتھ داخل ہوئیں۔ میں نے اٹھنا چاہا۔

''نہیں! نہیں! لیٹی رہو۔'' وہ میرے قریب آگئے۔ ''یہ اچانک بخار کیسے ہوگیا؟''

''ابا حضور! ان کے سینے میں درد بھی ہے ذرا کسی کو دکھایئے۔'' رضیہ آپا مجھ سے پہلے بول اٹھیں۔

نواب صاحب فکر مند ہوگئے۔

''روبی بیٹا! ذرا آنکھیں کھولو۔ بیگم کہہ رہی تھیں تمہاری آنکھیں آشوب کرائی ہیں۔'' انھوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ لیکن روشنی سے مزید چبھن سی محسوس ہوئی۔ میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

''اللہ اپنا رحم کرے۔'' نواب صاحب نے فرمایا۔ ''منصور! ذرا ہسپتال سے

پنسلین تو منگواؤ۔‘‘

بوا ربڑ کی بوتل میں پانی گرم کر لائی۔

’’بیٹا! یہ بستر میں رکھ لو تو گرم ہوجائے گا۔‘‘ بوا کا پرخلوص چہرہ فکر سے مرجھایا ہوا تھا۔

’’رضیہ! تم روبی کے پاس ٹھہرنا۔ پرائی اولاد کا زیاہ فکر ہوتا ہے۔ اللہ خیریت رکھے۔ اور ہم امانت واپس لوٹا سکیں۔‘‘ بڑی اماں نے کہا۔

’’یہ کیا کہا تم نے بیگم؟ پرائی اولاد۔ خدا گواہ ہے روبی مجھے اپنے بچوں ہی کی طرح عزیز ہے۔ ممتاز کی بیٹی میرے گھر میں پرائی کیسے سمجھی جا سکتی ہے۔‘‘

بڑی اماں ناراض ہوگیئں۔ اور نواب صاحب کے ساتھ باہر تشریف لے گئیں

رضیہ آپا رات میرے ہی کمرے میں سوئیں۔ صبح تھرما میٹر لگایا تو بخار ۱۰۴ تھا۔ رات بھر آنکھوں میں چبھن سی محسوس ہوتی رہی۔ گھنٹے گھنٹے بعد آپی پنسلین ڈالتی رہیں۔ نواب صاحب دن میں کئی بار آئے۔ یوں تو بوا نے رانی ماں سے بھی ڈاکٹر بلانے کو کہا تھا۔ مگر جب اس نے نواب صاحب سے کہا تو مجھے رنج ہوا۔ خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ اور پھر پہلے کبھی ڈاکٹر کو نہیں بلایا گیا۔ میرا ذہن اُلجھ گیا۔

شام کو نواب صاحب تشریف لائے۔

’’روبی بیٹا! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔‘‘

’’ابا حضور! آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ خود ہی ٹھیک ہوجاتی۔‘‘

’’نہیں! نہیں! ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔ خدا نہ کرے جو تکلیف بڑھ گئی تو۔‘‘ وہ دروازے سے باہر چلے گئے۔

میری آنکھیں کھلی تھیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ پہلے نواب صاحب اندر داخل ہوئے اور پھر— ڈاکٹر اسلم۔ مجھے دیکھ کر وہ بھونچکا سے رہ گئے۔

’’آپ—؟‘‘

’’نواب صاحب قبلہ! یہ تو میری ہمسفر رہ چکی ہیں۔ اور ہماری محسنہ بھی ہیں۔‘‘

نواب صاحب کے استفسار پر انھوں نے مختصراً ملاقات کا حال سُنایا۔

''اسلم بیٹا! غور سے دیکھنا اور بہترین علاج کرنا۔ روبی میری اولاد نہ سہی لیکن مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز ہے۔''

''آپ مطمئن رہیے۔'' وہ میری نبض چھوڑ کر اسٹیتھکسوپ لگاتے ہوئے بولے۔

''ذرا گرم پانی مل سکے گا؟''

نواب صاحب کو خود جانا پڑا۔ مغلانیاں تو پردہ کرتی تھیں۔ بوا میرے لیے کچھ تیار کرنے گئی تھی۔ بڑی خاموشی چھا گئی۔ ڈاکٹر بڑے غور سے میرا معائنہ کر رہے تھے۔

''یہ آپ بیمار کیسے ہوگئیں؟'' عجیب سوال تھا۔

''جی! وہ جیسے باقی مریض بیمار ہوتے ہیں۔''

''یعنی؟'' وہ میری الجھن پر مسکرائے۔

''بخار نے بتایا ہی نہیں وہ کیسے، کیوں، کب اور کس طرح آیا ہے۔''

''اور اب ذرا آنکھیں دکھایئے۔''

''کیوں آپ نے کیا قصور کیا ہے؟'' میں ان کے ذومعنی جملے پر مسکرا دی۔

''میرا مطلب تھا میں آپ کی آنکھیں طبی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے اپنی تصحیح کی۔

''لالہ کیسی ہے؟''

''صبح شام آپ کا ورد کرتی ہے۔ سوال یہاں رسائی کا تھا۔ آپ کی بیماری کی خبر کو وہ یقیناً مژدہ سمجھے گی۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ اب آپ کی مزاج پُرسی کے بہانے تو وہ آسکتی ہے نا۔''

نواب صاحب گرم پانی لے آئے۔

''ابا حضور! بوا کہاں ہے۔ اُسے کہہ دیا ہوتا آپ خود کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔''

''تم اچھی ہو جاؤ۔ بس میری تکلیف کا معاوضہ مجھے مل جائے گا۔''

''آپ کب آئے ڈاکٹر؟'' منصور بھیا نے اندر آ کر پوچھا۔

''تھوڑی دیر ہوئی۔ کہئے کیا حال ہے؟''

''بیمار منصور بھیا نہیں (میری طرف اشارہ کر کے) وہ ہیں۔'' نامعلوم ارشد بھائی کب آ گئے تھے۔

''مولانا ارشد صاحب! آپ کیسے ہیں؟'' اسلم مسکرائے۔

بوا چائے لے کر داخل ہوئی۔

''آپ کو باہر منشی بلا رہا ہے۔ شاید کوئی تار آیا ہے۔'' وہ نواب صاحب سے مخاطب تھی۔ جو فوراً اٹھ کر باہر چلے گئے۔

''کیسی ہو بوا؟'' اسلم مسکرا کر بولے۔

''اچھی ہوں۔ لالہ بٹیا تو ٹھیک ہیں؟''

''بس تمہاری دعا چاہئے۔''

''یہ آپ کی بوا سے کب کی واقفیت ہے۔'' ارشد بھائی شرارتاً مسکرا کر آہستہ سے بولے۔

''بہت پرانی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اور تینوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اچانک کسی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کون ہے؟'' میں چونک پڑی۔

''میں ہوں اسلم۔'' وہ حسب معمول مسکرائے۔ ''منصور بھئی ذرا مدد کرنا۔ آنکھیں دھونی ہیں۔''

منصور بھائی شاید چائے بنا رہے تھے۔ جو ارشد بھائی اٹھ آئے۔

''پندرہ پندرہ منٹ بعد دوا ڈالتے رہا کریں۔'' اسلم دوا ڈالتے ہوئے بولے۔

''اب ذرا چائے کے ساتھ بھی انصاف کیجئے۔'' ارشد بھائی بولے۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں منصف یا جج نہیں۔'' اسلم ہاتھ

دھوتے ہوئے بولے۔

''ڈاکٹر! میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ کے آنے یا بلانے کی خواہش کسی کے دل میں نہیں ہوتی۔'' ارشد بائی کچھ کھاتے ہوئے بولے۔

''بھئی وہ کیوں؟'' اسلم حیرانگی سے بولے۔

''وہ اس لیے کہ ڈاکٹروں کا آنا صرف بیماری میں ہوتا ہے۔ اور بیماری کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ میں نے جب بڑی اماں سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں تو جانتے ہیں انھوں نے کیا کہا۔ انھوں نے فرمایا۔ اللہ نہ کرے اس گھر میں ڈاکٹر آئے۔''

''حالانکہ ڈاکٹر سب کا خادم ہوتا ہے۔'' اسلم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ تو ظاہر ہی ہے۔'' ارشد بھائی نے کہا۔

''مِس ممتاز! آپ جاگ رہی ہیں۔'' اسلم نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''چائے لیجئے گا۔''

''جی نہیں۔ شکریہ۔''

''انھیں صرف چائے دی جائے۔'' وہ شاید بوا کو کہہ رہے تھے۔ میں چپ چاپ لیٹی ان کی باتیں سنتی رہی۔

''ہم نے مریض کے کمرے میں خاصا اودھم مچایا ہے۔'' منصور بھائی نے کہا۔

''حالانکہ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔'' اسلم بولے۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں دوا بھیجوں گا۔ ساتھ ہی ہدایات ہوں گی اور ہاں مس ممتاز! اگر آپ آنکھیں کھولنا چاہیں تو سیاہ چشمہ ضرور لگا لیا کریں۔''

میں نے ایک لمحہ کے لیے پوری آنکھیں کھول کر ارشد بھائی کو دیکھا۔ مگر شرمندہ ہونا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔

کافی دیر میں اکیلی لیٹی رہی۔ آپی نامعلوم کہاں تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں کچھ لوگ آ گئے۔ گرم گرم گفتگو ہو رہی تھی۔

''تو وہ چلا گیا ڈاکٹر؟'' بڑی اماں نے غصے سے پوچھا۔

''جی ہاں ابھی گیا ہے۔ کہئے تو بلا لاؤں۔ کوئی کام ہے ان سے؟'' ارشد بھائی بولے۔

''اور تم وہاں کیا کرتے رہے اتنی دیر؟''

''اماں جی! میں چائے پیتا رہا۔''

''مگر کیوں؟'' بڑی اماں کی جرح جاری تھی۔

''اماں جی! ڈاکٹر ہمارے مہمان تھے۔ ان کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔'' منصور بھائی سنجیدگی سے بولے۔

''تم آخر سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ روبی ہمارے ہاں رہتی ہے اب کسی کو کیا پتہ کہ وہ غیر ہے۔ کل ہی دیکھ لینا سب جگہ مشہور ہو جائے گا کہ صاحبزادیوں کے پاس ڈاکٹر جاتے ہیں۔'' بڑی اماں بولیں۔

''مگر اماں جی! ہم نے ڈاکٹر کو کوئی شوقیہ تو بلوایا نہیں تھا۔ ڈاکٹر ہمیشہ مجبوراً بلوایا جاتا ہے اور پھر اگر ہم نہ جاتے تو روبی گھبراتیں۔'' منصور بھائی کہہ رہے تھے۔

''اور پھر یہ بات بھی مشہور ہو جاتی۔'' ارشد بھائی نے لقمہ دیا۔

''دیکھو ارشد! ہر بات میں شرارت اچھی نہیں۔'' بڑی اماں نے ڈانٹا۔ ''آج کان کھول کر سب سن لو۔ روبی آزاد گھرانے سے آئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہرگز نہیں ہے کہ تم سب بھی اس کی دیکھا دیکھی وہی حرکتیں کرنے لگو جو آج تک ہمارے گھرانے میں نہیں ہوئیں۔''

''مگر آپا! چاہے روبی آزاد گھرانے سے آئی ہے۔ لیکن اس کی شرافت اور نجابت کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے۔'' رانی ماں بولیں۔

''تم نہیں سمجھتیں خاندان بھر میں بات پھیل جاتی ہے۔ اور جب بات پھیلتی ہے تو ہمیشہ بڑی ہو کر۔''

''اماں نا معلوم کیوں وہم کرتی ہیں۔ روبی اپنی برادری میں سے ہی ہیں۔ پھر وہ

اتنی بھولی اور نیک ہے۔'' رضیہ آپا نے کہا۔
''جیسی تم بھولی ہو۔'' ارشد بھائی چڑانے کو بولے۔
''پرائی اولاد رکھنا بڑی مصیبت ہے۔ اور......'' بڑی اماں بولیں۔
''یہ کیا کانفرنس ہو رہی ہے؟'' غالباً نواب صاحب باہر سے تشریف لائے تھے۔
''کچھ نہیں ابا حضور! بڑی اماں کہہ رہی تھیں کہ پرائی اولاد کو رکھنا مصیبت ہے۔'' ارشد بھائی بارود کو دِیا سلائی دکھانے کے انداز میں ادب سے بولے۔
''بیگم! خدا جانتا ہے روبی مجھے منصور سے زیادہ عزیز ہے۔'' نواب صاحب زور سے بولے۔
''تب ہی ڈاکٹر پر ڈاکٹر چلے آرہے ہیں۔'' بڑی اماں نے کہا۔
''ہوں! ڈاکٹر یہاں نٹ کا تماشہ دیکھنے نہیں آیا تھا۔ وہ بیمار ہے خدا نہ کرے جو اُسے کچھ ہوگیا تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا۔''
''ابا حضور! ڈاکٹر نے کیا کہا؟'' منصور بھائی نے بات بدلی۔
''شکر ہے نمونیہ نہیں ہوا۔ انفلوائنزا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا۔
''اے ان ڈاکٹروں کی بھی بھلی پوچھی۔ یہ تو وہ بیماری بتائیں گے جو کبھی نہ سنی ہو۔'' بڑی اماں نے کہا۔
''اسے ہم سے بیر تو نہیں تھا۔ تم نامعلوم روبی سے کیوں چڑتی ہو۔ حالانکہ وہ غریب اتنی نیک اور سعادت مند ہے۔'' نواب صاحب نے فرمایا۔
''ہاں! وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ اسی لیے کہہ رہی تھی کہ پرائی اولاد رکھنا مصیبت سے کم نہیں۔ آج وہ میرے مقابلے میں نیک اور سعادت مند گنی جانے لگی۔ منصور سے بڑھ کر وہ عزیز ہے۔ کل کو ہمیں گھر سے نکلوائے گی۔'' بڑی اماں رونے کی تیاریاں کرنے لگیں۔
''بیگم! تمھارے آنسوؤں کی قیمت میں جانتا ہوں۔ ان کے بہنے پر میں اپنی زندگی کا رخ بدل سکتا ہوں۔ مگر تمھارے یہ آنسو روبی کی زندگی سے قیمتی نہیں ہیں۔ تم سمجھنے

کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ ممتاز کی ایک ہی بچی ہے۔ دنیا میں اس نے کون سا سکھ دیکھا ہے۔ بیاہ کے دو سال بعد بیوی چل بسی۔ اس کی دنیا تو روبی ہی کے دم سے آباد ہے۔''

''مگر پھر بھی اپنی اولاد سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔'' بڑی اماں بدستور ناراض تھیں۔

''بیگم! میں تمھیں کیسے سمجھاؤں۔''

مغرب کی اذان ہونے لگی۔ سب اُٹھ کر صحن میں چلے گئے۔

میں سوچنے لگی یہ زندگی بھی کیا ہے۔ بوجھ بن کر جینے سے تو موت بہتر ہے۔ کس قدر مجبور ہوں میں بھی۔ زندگی پر اختیار نہ موت ہی بس میں۔ کھوئے ہوئے خوشی کے لمحات کو بے بسی سے کھڑی دیکھتی رہوں۔ اپنے دل کی ویرانی کو۔ زندگی کی المناک کہانی کو۔ غموں کی اس روانی کو۔ کچھ بھی تو میرے اختیار میں نہیں۔ صرف پاپا کے جانے سے یہ انقلاب آ گیا۔ صرف اس انقلاب نے زندگی کی سیدھی راہ کو پُر پیچ ویران پگڈنڈیوں میں بدل دیا تھا۔ خوشیوں کے سمندر کی لہروں کا جوش ختم ہو چکا تھا۔ زندگی ایک مسلسل بوجھ اور الجھن بن کر رہ گئی تھی۔ صرف مجبوریاں ہی مجبوریاں۔ بے حس بن کر جینا خوشیوں سے منہ موڑے رکھنا۔ مسکراہٹوں کو آہوں میں ڈھالتے رہنا ہی زندگی ہے۔ آنسو ہر حالت میں ساتھ دیتے ہیں۔

بوا نے پہلی مرتبہ ایسی گفتگو سنی تھی۔ وہ مجھ سے منہ چھپائے جائے نماز پر بیٹھی رو رہی تھی۔

''روبی!'' کسی نے آہستہ سے پکارا۔

''جی!''

آپی تھیں۔

''رو رہی ہو۔ کیا ہوا؟'' ان کی آواز بھی اداس تھی۔

''کچھ نہیں آپی! رو تو نہیں رہی۔ آنکھیں دُکھتی ہیں نا اس لیے۔''

''چائے پیو گی؟''

''نہیں ابھی نہیں۔''

''تم بہت بے موقع بیمار ہوئیں۔ ماموں میاں کی صاحبزادی کی شادی ہے۔ تیاری میں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''جلدی ہی ٹھیک ہوجاؤں گی۔ آپ کام تو شروع کیجیے۔''

''روبی! ویسے تو ماموں میاں بھی نواب ہیں۔ مگر ان کے بچے بہت پڑھے لکھے اور مہذب ہیں۔ مگر ماموں بالکل ہماری طرح ہیں۔ ممانی تو پندرہ سال ہوئے انتقال کرگئی تھیں۔ شفو آپا مجھ سے ایک سال بڑی ہیں۔ انھیں کی شادی ایک ڈاکٹر سے ہورہی ہے۔ اسی سال انھوں نے بی۔ اے کیا ہے۔ ثریا ان سے چھوٹی ہیں۔ ہمارا خیال ہے منصور بھیا کے لیے انھیں مانگ لیں۔ وہ ایف اے میں ہیں۔ ایک لڑکا ہے۔ اختر بھائی بہت فیشن ایبل ہیں۔ بالکل انگریزی طریقے ہیں سب کے۔ سنتے ہیں یہ ڈاکٹر بھی ان کے دوست ہیں۔ ڈاکٹر بھیا کی تین چار بہنیں ہیں۔''

''اچھا ہے شفو آپا کا دل لگا رہے گا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ رکیں۔ ''بڑی اماں پریشان ہیں۔''

''کیوں؟''

''ہم سب نے صلاح کی ہے کہ جو کچھ بھی دیا جائے جدید ہو۔ تاکہ شفو آپا کی سسرال والوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ پھر ارشد کا خیال ہے کہ اس طرح تمام خاندان میں یہ چرچا بھی نہ رہے گا کہ صرف اختر ہی پڑھ کر ترقی پسند ہوگئے ہیں۔ بلکہ باقی بھی کچھ ہیں۔

''کسی حد تک ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ارشد بھائی۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

''آپ سب کا مطلب ہے کم از کم آپ اور فرخندہ فرحت علیحدہ علیحدہ تحفے دیں۔ بڑی اماں نے جو کچھ بھی بنوانا ہو۔ مغلانیوں سے نہ بنوائیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بڑی اماں کو بتاتی ہوں۔'' وہ خوش خوش اُٹھ کر چلی گئیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اسلم روز دیکھنے آتے رہے۔ بخار اتر چکا تھا۔ آنکھوں کی تکلیف بہت کم رہ گئی تھی صرف کمزوری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جسم تحلیل ہوگیا ہو۔ طاقت کے انجکشن روز لے رہی تھی۔ مگر ہنوز کمزوری پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ نواب صاحب کا زیادہ وقت میرے پاس گذرتا۔ باقی بھی کئی کئی بار آتے۔ بڑی ماں پہلے سے نرم ہوچکی تھیں۔ ویسے وہ بیاہ کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

بیاہ کی تاریخ دس دن آگے پڑ چکی تھی۔ میں نے انھیں ہر ممکن طریقے سے مطمئن کیا کہ بس میں ٹھیک ہوتے ہی کپڑوں اور زیورات کا انتظام ان کے کہنے کے مطابق کردوں گی۔ وہ میری صحت یابی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

نواب صاحب دو دن سے بہت مصروف تھے۔ کوئی وزیر آیا ہوا تھا۔ وہ صاحبزادوں کو لے کر نکلے ہی تھے کہ ڈاکٹر اسلم آ پہنچے۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' انھوں نے شگفتگی سے پوچھا۔

''شکریہ۔ اب تو اچھی ہوں۔''

''لالہ پیار دعائیں اور نا معلوم کیا دے رہی تھی۔ بہت بہت پوچھ رہی تھی۔''

''جھوٹ خاصہ بول لیتے ہیں آپ۔''

''یعنی؟''

''چاہے لالہ کو میں یاد بھی نہ ہوں۔''

''نہیں! نہیں! یہ زیادتی ہے۔ وہ روز آنے کو کہتی ہے لیکن وہ دیکھئے نا مجھے فرصت ہی کم ملتی ہے۔ ہسپتال سے سیدھا اِدھر ہی آجاتا ہوں۔''

''ڈاکٹر! میں کب تک چل پھر سکوں گی؟''

''بس یہ ہفتہ ذرا کم کام کیجئے۔ ویسے چل پھر تو آپ اب بھی سکتی ہیں لیکن ذرا کم۔ اور یہ آج باقی سب کہاں ہیں؟''

''کسی جلسے میں گئے ہیں۔ آپ نہیں گئے؟''

''کیا وہاں جانا یہاں آنے سے زیادہ ضروری ہے؟''

میں خاموش رہی۔

''بوا! ذرا یہ اُبال لاؤ۔'' انھوں نے سرنج اور سوئی بوا کی طرف بڑھا دی۔

بوا چلی گئی۔ خاموشی مسلّط ہوگئی۔ دل کچھ گھبرا سا گیا۔

''ڈاکٹر! آپ کو راجگڑھ کیسا لگا؟'' میں نے سوچا کچھ تو کہا جائے۔

''جنت سے زیادہ خوبصورت۔'' وہ مسکرائے۔ ''یہاں آتے ہی جو شگون اچھا ہوگیا تھا۔''

''کیسا شگون؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''آپ سے ملاقات''

میں گھبرا گئی۔ یہ ڈاکٹر آج کیسی عجیب باتیں کر رہے تھے۔

''اور جو مجھ سے ملاقات نہ ہوتی؟'' میں نے ہنسی میں بات ٹالنی چاہی۔

''تو راج گڑھ میں یہ خوبصورتی بھی نہ ہوتی۔''

بات وہیں رہی۔

''آپ بھی نرے وہمی ہیں۔'' میں نے پھر مذاق سے کہا۔

''تھا تو نہیں۔ ہوگیا ہوں۔ سوچتا ہوں جب اچھی ہوجائیں گی تو کیا ہوگا۔''

''عجیب سوچ ہے ڈاکٹر! میرے علاوہ بھی تو مریض ہیں۔ ان کا علاج کیجئے گا۔'' میں واقعی گھبرا گئی تھی۔

''یہ بات نہیں۔ یونہی وہم ہوگیا ہے کہ جس روز آپ کو دیکھ نہ لوں۔ وہ دن اچھا نہیں گذرتا۔''

''کیوں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

''وہ— میرا دل کام میں نہیں لگتا۔ پھر تمام دن۔'' ان کی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

میری جان نکل گئی۔ یہ ڈاکٹر کیا سمجھ رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر بوا آ گئی۔ مجھے خاموش رہنا پڑا۔

تمام رات میں سوچتی رہی۔ یہ اسلم کیا کہہ رہے تھے۔ میں اُلجھ سی گئی۔ کیا مصیبت ہے نامعلوم وہ میری خاموشی کو کیا سمجھتے ہوں گے۔ کاش! میں جواب دے سکتی۔ تو شاید ان کے رجحان کا رخ بدل جاتا۔ مگر— اور جو وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے تو میرے اللہ میں کیا کروں کیا سمجھوں۔ شاید وہ ہر مریض سے ایسی ہی باتیں کرتے ہوں۔ مگر وہ ان کا لہجہ۔ ان کی باتیں۔ پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ پہلی اُلجھنیں کیا کم تھیں جو ایک اور الجھن اور پیدا ہوگئی۔ میری خاموشی سے ان کے احساسات کو تقویت پہنچے گی۔ مگر میں کیسے کہوں۔ اور کہہ بھی کیا سکتی ہوں۔

کافی دنوں کے بعد نہا کر نماز پڑھی تو دل کو کچھ سکون سا ملا۔ پیلی پیلی اُداس دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کافی دنوں بعد نکلی ہوئی دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میرا سہ ماہی امتحان شروع ہوچکا تھا۔ مگر بخار کی وجہ سے میں شریک نہ ہوسکی تھی۔ کتابوں کا برا حال ہورہا تھا۔ بوا کمرے کو تو شیشے کی طرح چمکا چکی تھی۔ میں کتابیں سلیقے سے شیلف میں لگانے لگی۔

''روبی!''

''آیئے آپی!'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو'' وہ مسکرائیں۔

''کس بات کی؟''

''غسلِ صحت کی۔''

ہم دونوں ہنس پڑیں۔

''بڑی اماں بلا رہی ہیں تمھیں۔'' وہ ذرا سنجیدگی سے بولیں۔

میں آپا کے ساتھ ہولی۔ بڑی اماں اپنے کمرے میں دیوان پر بیٹھی پان کھا رہی تھیں۔

''آداب عرض۔'' میں نے اندر جا کر کہا۔

''جیتی رہو''

''آپ نے مجھے یاد فرمایا۔''

''ہاں — اِدھر بیٹھ جاؤ میرے پاس۔ کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟'' انھوں نے کسی قدر شفقت سے پوچھا۔

''آپ کی دعا سے اب تو اچھی ہوں۔''

''میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ کچھ مدد لے سکوں۔ تمھیں فرصت تو ہے نا؟''

''جی ہاں۔ بالکل کوئی مصروفیت نہیں ہے آپ فرمایئے۔''

''وہی شفقت آرا کی شادی کا قصہ ہے۔''

''پہلے آپ یہ فرمایئے کہ دینا کیا ہے؟''

''گیارہ جوڑے دو سیٹ زیورات کے گیارہ بستر اور سو برتن۔'' بڑی اماں نے فرمایا۔

''پانچ سوٹ پانچ بستر اور ایک سیٹ میں دوں گی۔'' رانی ماں نے کہا۔

''یہ بستروں کا انتظام تو ہو ہی جائے گا۔ ان میں سے صرف ایک کندن کا سیٹ تیار ہے۔ تم لوگ بھلا کہاں سے کپڑے بنوایا کرتے تھے؟'' بڑی اماں نے پوچھا۔

''جی ایک میری سہیلی ہیں ناز۔ اس کے تینوں بھائی کپڑے زیورات اور کپڑوں کی سلائی وغیرہ کی فرموں کے مالک ہیں۔ ہمارے شہر میں تو لوگ تمام جہیز کا آرڈر انھیں دے کر خود دردسری سے بچ رہتے ہیں۔''

''تمھارے گھریلو تعلقات بھی تو ہوں گے؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''بہت زیادہ بالکل اپنے عزیزوں کی طرح۔''

''تو کیوں نہ ان سے انتظام کرالیا جائے؟''

''روبی! تمھارے پاس وہاں کے بنے ہوئے کپڑے تو ہوں گے؟'' مجھ سے پہلے رضیہ آپا بول اٹھیں۔

''جی ہاں۔ میرے تقریباً تمام کپڑے وہاں کے بنے ہوئے ہی ہیں۔ ویسے جو بھاری کام والے کپڑے ہیں وہ بھی انھوں نے بنوائے ہیں۔''

''تو کیوں نہ پہلے انھیں دیکھ لیا جائے۔''

میں نے تمام کپڑے دکھا دیئے۔ بڑی اماں بہت خوش ہوئیں۔ طے یہ پایا کہ بوا کو میں دستی رقعہ دے کر روانہ کروں۔ اور وہ وہاں کے بہترین تیار شدہ سوٹ اور زیورات لے آئے۔

''مگر اماں جی! پہلے نواب صاحب سے تو پوچھ لیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''انھیں کیا اعتراض ہوگا۔'' کہتے ہوئے بڑی اماں نواب صاحب کے کمرے میں چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی منصور ارشد اور ظفر بھائی آ گئے۔

''کیا خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے؟'' ظفر بھائی بولے۔

''شفو آپا کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔'' آپا رضیہ نے جواب دیا۔

''بھئی کیا خوب لڑکی ہے شفقت آرا بھی۔ واہ ہر فن میں طاق۔ پڑھ لکھ کر ہر لڑکی اگر ان جیسی بن جائے تو تعلیم کا نام روشن ہوجائے۔'' ارشد بھائی نے مجھ پر بھرپور چوٹ کی۔

''اب تعریفیں کرنے سے کیا فائدہ۔ ان کی تو شادی تک طے پا چکی ہے۔'' فرخندہ نے شرارتاً کہا۔

''ہاں جانتا ہوں۔'' ارشد بھائی نے مصنوعی آہ بھری۔ ''مگر ان کا تو سارا خاندان ہی ایسا ہے۔''

''باقی خاندان میں رہا ہی کون۔ صرف اختر بھائی اور ثریا ہی تو ہیں۔'' فرحت بولیں۔

''اور ثریا آپا کے تو جملہ حقوق بھی محفوظ ہیں۔'' ظفر بھائی منصور بھائی کو شریر نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہٹاؤ اس قصے کو۔'' منصور بھائی جھینپے۔ ''رانی ماں! آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟''

''ذرا سر میں درد ہے۔''

''لایئے میں دبا دوں۔'' میں نے کہا اور ان کا سر اپنی گود میں رکھ کر دبانے لگی۔
''تم رہنے دو روبی! رضیہ دبا دے گی۔''
''رانی ماں! اس طرح چڑھ کر بھی اگر لوگ تعلیم کا نام روشن کرنے کے لیے اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرنے لگیں تو حرج ہی کیا ہے۔'' ارشد بھائی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔
''سب ہنس پڑے۔ میں خاموش ہی رہی کہتی بھی کیا۔
چند لمحات بعد بڑی اماں لوٹ آئیں۔
''کیا کہا ابا حضور نے؟'' آپی نے انتہائی اشتیاق سے پوچھا۔
''مان گئے ہیں بوا کے ساتھ منشی کو بھیج رہے ہیں۔'' انھوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
ان کے کہنے کے مطابق ان کے سامنے بیٹھ کر ناز کو لکھتی گئی۔ رضیہ آپی فرحت اور فرخندہ کے دینے کو تحفے اور تین تین سوٹ بھی لکھے۔
''روپیہ کتنا دیا جائے؟'' بڑی اماں نے پوچھا۔
''جتنا آپ مناسب سمجھتی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''میرا خیال ہے پانچ چھ ہزار کافی ہیں۔''
''جی ہاں کافی ہے۔''
سب متفق تھے بوا صبح کی گاڑی سے جارہی تھی۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے ناز کو بہترین سے بہترین چیزیں بھیجنے کو لکھا۔
''بیٹا! تم نے اپنے لیے تو کچھ منگوایا ہی نہیں۔'' بوا نے کہا۔
''مگر بوا! مجھے کون سا بیاہ پر جانا ہے۔''
''شاید جانا ہی پڑ جائے۔ لکھ دو اپنا بھی۔'' بوا مصر تھی۔
''نہیں بوا! پاپا انھیں میرے لیے جاتی مرتبہ روپے دے گئے تھے اور وہاں سے بھی بھیجتے رہنے کو کہہ گئے ہیں۔ میرے کپڑے اگر تیار ہوگئے ہوں تو لیتی آنا۔ یہ سو روپیہ ناز کو میری طرف سے دینا کہ چند نہایت خوبصورت بروچ اور ایک کسی کو دینے کے لیے تحفہ بھیجے۔''
صبح بوا جانے کے لیے باہر نکلی۔

''بوا! اسکول بھی جانا۔ میرا سلام سب کو کہنا۔ ناز کی بھابھیوں اور امی کو بھی۔ اور ......'' نامعلوم کیوں میرا دل بھر آیا۔

''بوا! جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ آئندہ جمعہ کو ہم چلے جائیں گے۔''

''بیگم صاحبہ! آپ فکر نہ کیجئے۔ چھ سات دن بعد آ جاؤں گی۔'' بوا نے کہا۔

''میرا خیال ہے اماں جی! بوا اس سے بھی پہلے آ جائے گی، وہاں تمام کام تیار ہی ہوتا ہے۔ اور پھر میں نے تاکید بھی بہت لکھی ہے۔''

بوا اور منشی رخصت ہو گئے۔

صبح سو کر اٹھی تو سر میں درد تھا۔ گھر میں بیاہ کی تیاریوں کی وجہ سے بڑا شور وغل تھا۔

میں بھی بڑے کمرے میں بیٹھی تو آپی صاحب کا سوئیٹر بُن رہی تھی۔ چونکہ نواب صاحب خود بھی تشریف رکھتے تھے اس لیے سب کسی قدر مؤدب تھے۔

''روبی بیٹا! سوئیٹر تو ہو گئے اب اور رہنے دو۔'' نواب صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''میرا بیاہ تو ٹھاٹھ سے گذرے گا۔ بلکہ یہ بھی منصور کو دے دو۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔''

''ابا حضور! بیاہ پر پہننے کے لیے میرا سوٹ بھی گرے ہے۔'' منصور بھائی میرے ہاتھوں میں گرے اون دیکھتے ہوئے بولے۔

''مگر ابا حضور! یہ سخت ناانصافی ہے۔'' ظفر بھائی بولے۔

نواب صاحب مسکرائے۔ ''منصور سب سے بڑا بھی تو ہے۔''

''اور میں سب سے چھوٹا۔'' نسیم بھائی بال سنوارتے ہوئے بولے۔

''بھئی روبی! کتنی اون بھیجی ہے ممتاز نے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جی! چھ سوئٹروں کی۔''

''دو تو تم نے مجھے بن دیئے ہیں اور باقی رہ گئے ہیں چار۔''

''یعنی چار سوئٹر اور چار ہم۔ کام مساوی ہے۔'' ارشد بھائی نے کہا۔

''اے ہے اب اتنے دنوں میں چار سوئیٹر بنے جاتے ہیں۔'' بڑی اماں نے

کہا۔

''کیوں روبی؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔

''ابا حضور! ایک تو بوا بُن گئی ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں یہ ختم ہوجائے گا۔ باقی دو بن دوں گی۔''

بڑی اماں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن چاروں بھائیوں نے شور مچا کر روک دیا۔

نواب صاحب ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔

''اے مغلانی! وہ برتن قلعی ہو کر آگئے ہیں؟'' بڑی اماں نے پوچھا۔

''برتن تو آ ہی جائیں گے۔ مجھے تو آپ کی باقی تیاری کی فکر ہے۔'' ارشد بھائی مغلانی سے پہلے بول اٹھے۔

''باقی تیاری کی فکر کی کون سی بات ہے؟'' رانی ماں نے پوچھا۔

''رانی ماں! آپ لوگ بوا کو بھیج کر یوں مطمئن ہوگئے ہیں جیسے وہ یقیناً تمام کر کے وقت سے پہلے آجائے گی۔'' ارشد بھی اپنی عادت پر اُتر آئے۔

''ہائے تو نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اگر وہ نہ آئی تو کیا ہوگا۔ یہاں تو کوئی تیاری بھی نہیں ہے۔'' بڑی اماں متفکر ہوگئیں۔

''بڑی اماں! آپ فکر نہ کیجئے بوا ضرور آجائے گی۔'' میں نے کہا۔

''بڑی اماں! سوال بوا کے آنے کا نہیں۔ وقت سے پہلے آنے کا ہے۔'' ارشد بھائی مسکرا کر بولے۔

''بڑی اماں! بوا بچہ تو نہیں ہے۔ پھر اسے میری عزت اور اعتماد کا بھروسہ حاصل ہے۔'' میں نے بہ مشکل غصہ دبا کر کہا۔

''مگر پھر بھی مجھے تو فکر لگ گئی ہے۔ غلطی میری ہے رضیہ کے کہنے میں آگئی۔'' بڑی اماں بولیں۔

''اپنی غلطی کا خمیازہ بھی تو آپ کو بھگتنا پڑے گا۔'' ارشد بھائی طنز سے مسکرائے۔

میں اُلجھ گئی۔ نامعلوم انھیں مجھ سے کیا بیر تھا۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں نے بولنا چاہا لیکن میری نظریں بڑی اماں کے چہرے پر ہوتی ہوئی فرش پر چلی گئیں۔

کتنی بے بس ہے زندگی۔ وہی میں تھی جس کی خودداری تمام اسکول میں مشہور تھی۔ سب کہا کرتے تھے روبی جھکانا جانتی ہے مگر جھکنا نہیں۔'' اور اب — مجھے ہی جھکنا پڑ رہا تھا۔ اور یہ ہار مان لینا میری خودی کی موت تھی۔ ناز کہا کرتی تھی۔ ''روبی! کبھی تمہاری تنی ہوئی گردن کسی کے آگے جھکے گی بھی —؟'' میں ہمیشہ جواب دیتی۔ ''نازی! یہ گردن جھکنے سے پہلے ٹوٹ جائے گی۔''

مجھے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔ مگر ارشد بھائی کے سامنے رونا گویا اپنی ہار ماننا تھا۔

''ارشد! مذاق کی حد ہوتی ہے۔'' منصور بھائی بولے۔

''بھیا! مذاق نہیں۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ آپ خود ہی غور کیجئے نا۔'' وہ چالاکی سے بولے۔

''منصور! واقعی مذاق نہیں۔ واقعی اگر بوا نہ آئی تو کیا ہوگا۔'' بڑی اماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آپا! آپ خواہ مخواہ فکر کر رہی ہیں۔ بھلا بوا کیوں نہ آئے گی۔'' رانی ماں نے کہا۔

''اماں جی! روبی اور ناز کے اتنے گھریلو تعلقات ہیں۔ پھر روپیہ تک جا چکا ہے۔ بوا کے نہ آنے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں۔'' رضیہ آپی بولیں۔

''ہاں اماں بی! آپ کی فکر فضول ہے۔'' فرحت بولی۔

''یہ نہ کہو کہ فکر فضول ہے۔ جب تک بوا نہیں آ جاتی۔ فکر تو لگی ہی رہے گا۔'' فرخندہ ذرا قریب آ کر بولی۔

''بھئی یہ کیا بحث چھڑ گئی ہے بوا کے نہ آنے سے کون سی قیامت آ جائے گی۔''

نسیم بھائی ٹانگ پھیلاتے ہوئے بولے۔

''قیامت نہیں آئے گی تو کیا ہوگا۔ میں وہاں اپنا سر لے کر جاؤں گی۔'' بڑی اماں ناراض ہونے لگیں۔

''میں بتاؤں اماں! تار دے دیتے ہیں بوا کو'' ارشد بھائی اسی طرح مسکرا رہے تھے۔

''نہیں وہ بغیر تار کے آئے گی۔'' میں نہ چاہتی تھی کہ جبکہ بوا نے آنا ہی ہے تو ارشد بھائی کے تار کے مشورہ کو مان کر انھیں یہ موقع دوں کہ وہ یہ فخر محسوس کرسکیں کہ اُنہوں نے ہی تار دے کر الجھے معاملہ کو سلجھایا ہے۔

''اب آپ کو اختیار ہے۔'' وہ سعادتمندی سے کاندھے سکیڑ کر بولے۔

''نہیں! نہیں! ضرور تار دیا جائے۔'' بڑی اماں نے کہا۔

''تاکہ وہاں یہ سمجھا جائے کہ اتنے بڑے گھرانے کے لوگ محض چند ہزار روپوں کے لیے تار دیتے پھرتے ہیں۔'' منصور بھائی پہلی بار ذرا سخت لہجے میں بولے۔

''اگر بوا وقت پر نہ آئی تو تلافی کون کرے گا؟'' ارشد بھائی نے میرے وقار کو ٹھوکر لگائی۔

''میں کروں گی تلافی۔'' میں نے زور سے کہا۔ اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

منصور بھائی کی آواز مجھے سُنائی دی۔ ''تمھیں یہ نہ کہنا چاہئے تھا۔'' اُنہوں نے کہا تھا۔

میرا دل سلگ رہا تھا۔ مگر بھڑک کر بُجھ جانا میرے بس میں نہ تھا۔ ہلکا ہلکا دھواں اور جلن میرے رگ و پے میں سرایت کرچکی تھی۔ پاپا کی عزت کا جال میرے چاروں طرف بُنا ہوا تھا اسے توڑنا تو ایک طرف میں اس سے ٹکرا بھی نہ سکتی تھی۔ میرا ایمان ہے بیٹی ایک میٹھا پھل ہے مگر جب وہ اپنے باپ کی عزت سے ٹکراتی ہے تو وہ زہر سے زیادہ کڑوی بن جاتی ہے۔ پاپا کی عزت و وقار قائم رکھنے کے لیے ارشد بھائی کی زہریلی باتیں

اس ماحول کی تلخی تو کیا سولی پر سے بھی مسکراتی ہوئی گذر جاؤں گی۔ جہاں ارشد بھائی ہوں وہاں جایا ہی نہ کروں گی۔ بلکہ اپنے کمرے سے باہر بھی کم ہی نکلا کروں گی۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا۔

نیا سوئٹر شروع کرتے ہوئے ایک تلخ سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔تو کیا میں ارشد بھائی کے لیے سوئٹر بُنوں؟ جنہیں مجھ سے ازلی بیر ہے۔جنہوں نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ اگر میں دن کو دن کہوں تو وہ محض میری ضد میں آ کر دن کو رات کہنا شروع کر دیں گے۔

مجھے بچپن میں کونیونیٹ میں سیکھا ہوا بائیبل کا ایک جملہ یاد آ گیا۔

''دشمن اگر تمھارے ایک تھپڑ لگائے تو دوسرا رخسار بھی اس کی طرف کردو۔''

پھر انھیں مجھ سے دشمنی تھی مجھے تو نہیں۔ وہ اپنے ظرف سے گر جائیں تو گر جائیں۔ میں کیوں گروں۔ مجھے ان سے کون سے جائداد بانٹنی ہے۔ تین سال یہاں رہنا ہے تو کیوں نہ اس طرح رہوں کہ کسی کے دل میں میرا اکڑا بول نہ اٹکے۔ میں تیزی سے سوئیٹر بننے لگی۔

''باجی!'' میمونہ نے کمرے میں آ کر بڑی پیاری آواز میں کہا۔

''جی!''

''ہم نہیں بولتے آپ سے۔'' وہ منہ پھلا کر پرے بیٹھ گئی۔

''کیوں میمونہ! میں نے کیا کیا ہے؟''

''تمام دن بس اپنے کمرے میں رہتی ہیں کبھی باہر بھی نہیں نکلتیں۔''

''تو تم میرے کمرے میں آ جایا کرو۔''

''آپ باہر کیوں نہیں آتیں؟''

''کوئی خاص بات تو نہیں بس ذرا کام ہوتا ہے۔ یہ رضیہ آپا کیا کر رہی ہیں؟''

''بڑی اماں کے پاس بیٹھی ہیں۔''

''کیا ہو رہا ہے وہاں؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''وہی بوا کے نہ آنے کا قصہ چل رہا تھا۔'' میمونہ کی آواز دماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑی۔

میں خاموش ہوگئی۔ بوا کو گئے پانچواں دن تھا۔ بڑی اماں کے جانے میں تین دن باقی رہتے تھے۔

باہر کا دروازہ کھلا۔ بڑی اماں داخل ہوئیں۔ میں نے اُٹھ کر استقبال کیا۔

''تسلیم''

''جیتی رہو۔'' وہ بے حد متفکر تھیں اور یہ ارشد بھائی کی آگ لگائی ہوئی تھی۔

''بوا اب تک نہیں آئی تار دیئے دیتے ہیں۔''

''اماں جی! اتنے دن تو لگنے لازمی تھے آج اگر بوا نہ آئی تو تار دے دیں گے۔''

''تم باہر کیوں نہیں نکلتیں؟''

''جی! کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ بس یہ ذرا سوئٹر بنتی رہتی ہوں۔''

''اچھا! سب سمجھ رہے ہیں تم ناراض ہو۔'' وہ بڑی مضمحل ہو رہی تھیں۔

''نہیں اماں جی! ناراضگی کی کون سی بات ہے۔''

باہر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آپی کے ساتھ سب داخل ہوئے۔

''آپ کا تار۔'' منصور بھائی نے لفافہ میری طرف بڑھایا۔

میں نے جلدی سے کھول کر پڑھا۔

''کہاں سے آیا ہے تار؟'' بڑی ماں نے پوچھا۔

''ناز نے بھیجا ہے۔ بوا آج دوپہر کو آ رہی ہے۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں ارشد بھائی کی طرف اٹھ گئیں۔ جو محویت سے سنگار میز پر رکھی ہوئی میری تصویر کو دیکھ رہے تھے۔

''اُسے لینے ڈرائیور کو تو بھیجوں۔'' کہتی ہوئی بڑی ماں اٹھ کر چلیں۔

''مگر اماں! ابھی تو دو گھنٹے ہیں گاڑی کے آنے میں۔'' ارشد بھائی نے کہا۔

لیکن وہ جا چکی تھیں۔

''روبی! اب موقع ہے کہ تم ارشد کو شرمندہ کرو۔'' آپی مسکرائیں۔

''آپا! میں کسی سے الجھنا نہیں چاہتی۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھلا میں کیوں شرمندہ ہونے لگا۔'' ارشد بھائی بولے۔

''آفرین ہے تم پر ارشد!'' منصور بھائی بولے۔ ''کہاں وہ دعویٰ کہ بوا نہیں آئے گی۔ اور کہاں یہ حالت کہ شرمندہ تک نہیں ہوتے۔''

''بھیا! وہ تو مذاق تھا۔ ذرا چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔ اگر لڑائی کی کھٹ پٹ نہ ہو تو گھر پر ویرانے کا گمان ہونے لگے۔'' ارشد بھائی ہنستے ہوئے بولے۔

''لیکن لڑنا تمھیں اپنے برابر والوں سے چاہیے۔'' ظفر بھائی نے مشورہ دیا۔

''لڑتا تو میں ہرگز نہیں ہوں۔ صرف چڑاتا ہوں۔ اور وہ بھی چڑنے والوں کو۔'' وہ پہلو بدل کر بولے۔

''خیر روبی چڑتی تو نہیں ہے۔''

''جیسے تم نہیں چڑتیں۔'' وہ چڑا کر بولے۔

الماری کھول کر میں نے چاکلیٹ اور ٹافیاں پلیٹ میں ڈال کر میز پر رکھ دیں۔ ارشد اور ظفر بھائی جھپٹا مار کر آدھی سے زیادہ لے گئے۔

''بھئی یہ زیادتی ہے۔'' منصور بھائی بولے۔

کیونکہ زبردستی سے لی ہوئی ٹافیاں انھوں نے جیبوں میں ڈال لی تھیں۔ اور پلیٹ میں سے کھا رہے تھے۔

''اپنی اپنی قسمت ہے۔'' ارشد بھائی شرارتاً ہنسے۔

''آپی! آپ کیوں خاموش ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سر میں درد ہے۔''

''ابھی تو اصل تیاری شروع ہونی ہے۔ آج ہی اگر سر میں درد ہوا تو کام کیسے بنے گا؟'' فرخندہ نے پوچھا۔

''روبی! اسپرو ہوتو مجھے دینا۔''

میں نے لا کر دے دی۔

''آپی! واپسی کب تک ہوگی آپ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''پندرہ دن تو ضرور ہی لگ جائیں گے۔''

''اچھا!'' مجھے تعجب ہوا۔

''روبی! آپ نے تو یوں کہا جیسے آپ نہیں چل رہیں۔'' منصور بھائی بولے۔

''نہیں منصور بھیا! میں کیسے جاسکتی ہوں۔''

''یعنی واقعی۔'' سب چونکے۔ ''مگر کیوں؟''

''کتنا عجیب سا لگتا ہے میرا— وہ'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ بغیر دعوتی کارڈ کے شرکت نہ کریں گی؟''

''کچھ سمجھ لیجئے۔''

''چلا گیا ڈرائیور؟'' منصور بھائی نے پوچھا۔

''ہاں ابھی گیا ہے۔'' وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''تم ذرا سلیمان کا یہ خط تو پڑھ کر سناؤ۔''

''وہ خط پڑھنے لگے۔ جب انھوں نے یہ جملہ پڑھا ''سنا ہے محمد ممتاز مرزا کی صاجزادی آپ کے پاس ہے اُسے بیاہ پرضرور لے کر آئیں۔ تاکید ہے۔'' تو منصور بھائی میری طرف دیکھ کر ایک لمحہ کو رکے پھر آگے پڑھنے لگے۔

باہر جاتی مرتبہ رضیہ آپی مجھے بھی ساتھ لے گئیں۔ ''قسم توڑ دو اور کبھی باہر بھی نکلا کرو۔''

مجھے جانا پڑا۔ دیوان خانے میں بچھے ہوئے دیوانوں پر سب بیٹھ گئے۔ مسلسل بنتے رہنے سے میرا سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ مگر بڑی اماں کے سامنے اٹھ کر جانا گستاخی تھا جبکہ وہ خود ساتھ لائی تھیں۔ بڑے زور شور سے صلاح ہورہی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس سر جھکائے سوئیٹر بنتی رہی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد پھر وہیں آ بیٹھے۔

دو بجے کے قریب باہر کار آ کر رکی۔ تھوڑی دیر بعد بوا کا تھکا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے بڑی اماں کو سلام کیا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

''وہاں سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں! ہاں! خود ناز اور اس کی امی اور بھابھیاں ساتھ جا جا کر پسند کرتی رہیں۔ دو سوٹ خود کہہ کر تیار کرائے ہیں اسی لیے دیر لگ گئی۔''

بوا نے بکسوں کی چابیاں بڑی ماں کو تھما دیں۔

میں ناز کا بھیجا ہوا پیارا خط پڑھنے لگی۔ بڑی اماں تمام زیورات اور کپڑے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ایک ایک کو فخر سے دکھا رہی تھیں۔

ناز کی پسند ویسے ہی بہت اچھی تھی اور پھر میں نے تاکید بہت لکھی تھی۔

''اس بکس میں کیا ہے؟'' منصور بھائی بولے۔

''اس میں صاحبزادیوں کے دینے والے تحفے اور روبی بیٹا کے کپڑے ہیں۔''

''روبی! تم تو کہہ رہی تھیں کہ بیاہ پر جانا ہی نہیں۔ پھر کپڑے کیوں منگوائے۔ ہمیں بتایا بھی نہیں سب کام چوری چوری کرلیا۔'' فرخندہ بولیں۔

''روبی بیٹا نے مجھے کپڑے لانے کو نہیں کہا تھا۔ آقا انھیں روپیہ دے کر گئے تھے کہ روبی کے کپڑے بنوا کر بھیجتے رہا کریں۔ میں اگر نہ بھی جاتی تو بھی وہ کپڑے پارسل سے بھیج دیتے۔'' بوا نے وضاحت کی۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ چوری چوری انتظام کرتی۔ پھر آپ دیکھ لیں گی۔ کپڑے پھر بھی آتے رہیں گے۔'' میں نے فرخندہ سے کہا۔

تھوڑی دیر بوا انھیں سب سمجھاتی رہی۔ میں ناز کے خط میں کھو کر رہ گئی۔ کتنا خلوص تھا اس کے پیار میں۔ بے پایاں خلوص۔ بیکراں پیار۔ جوں جوں خط پڑھتی گئی یہ محسوس ہوتا رہا۔ جیسے وہ مخلص روح میرے پاس بیٹھی اپنے ہونٹوں پر مخصوص شریر سی مسکراہٹ لیے مجھے چھیڑ رہی ہے۔

''ناز! تم کتنی میٹھی اور مخلص ہو۔'' میرے دل کی دھڑکن نے سرگوشی کی۔

دوسرے دن صبح ہی نواب صاحب۔ رانی ماں۔ اور بڑی اماں روانہ ہوگئے۔ ہم سب تین چار دن بعد جانے والے تھے۔ بوا میرے پاس بیٹھی سوئٹر بن رہی تھی۔

''بس بیٹا! جسے ملی یہی پوچھتا روبی بھی آئی ہے۔ ناز بیٹا تو یہ جان کر کہ تم نہیں آئی ہو اتنا روئی کہ میں حیران رہ گئی۔''

''اچھا!'' میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ''دیکھئے خدا کب ملاتا ہے۔''

''اور ہاں ناز کی منگنی بھی تو ہورہی ہے۔''

''اچھا!'' میں اچھل پڑی۔ ''کب ہورہی ہے منگنی۔ کیسے لوگ ہیں وہ اور کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟''

''ناز کی امی کہہ رہی تھیں کہ وہ سب کچھ تمھیں لکھیں گی اور یہ بھی کہ منگنی سے پہلے وہ تار دیں گی تاکہ میں تمھیں وہاں لے جاؤں۔''

میں تصورات میں کھوگئی۔ ناز کی منگنی پر میں ضرور جاؤں گی۔ پاپا کو لکھ دوں گی وہ نواب صاحب کو لکھ دیں گے کہ مجھے جانے سے نہ روکیں۔'' نازی! سچ مچ تمہاری منگنی ہوجائے گی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا ہورہا ہے؟'' آپی آئیں۔ ''بہت خوش نظر آرہی ہو۔''

''آپی! میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش۔'' میں ان سے لپٹ گئی۔

''کیوں کیا خوش خبری سن لی؟''

''میری سہیلی ہے ناز۔ اس کی منگنی ہورہی ہے۔''

''مگر تمہاری خوشی اس خبر سے زیادہ ہے۔''

''ہاں آپی! دوہری خوشی ہے نا۔ ایک منگنی کی دوسرے اس سے ملنے کی۔''

میرا دل ناچنے کو چاہ رہا تھا۔

''اچھا ذرا باہر تو نکلو سارا دن اندر مقید رہتی ہو۔''

میں ان کے ساتھ صحن میں آگئی۔ بڑی دیر مزیدار باتیں ہوتی رہیں۔ انھیں

اپنے واقعات سناتی رہی۔ اچانک چاروں بھائی آ گئے۔

''بڑی محفل گرم ہے کیا ہو رہا ہے؟'' منصور بھائی نے پوچھا۔

''ابھی محفل میں گرمی کہاں۔'' ارشد بھائی بولے۔ ''محفل تو اب گرم ہوگی ہمارے آنے سے۔''

''آج سب بہت خوش نظر آ رہے ہیں آخر کیا بات ہے؟'' ظفر بھائی بیٹھتے ہوئے بولے۔

''روبی کی سہیلی ناز کی منگنی ہو رہی ہے۔ اسی بات کی خوشی ہے۔'' آپی نے جواب دیا۔

''بھلا اس میں خوش ہونے کی کون سی بات ہے؟'' ارشد بھائی نے پوچھا۔

''کیوں خوشی کی بات پر تو سب خوش ہوتے ہیں۔ آپ تو بس یونہی کرتے ہیں۔'' فرحت نے کہا۔

''آپ تو بس یونہی کرتے ہیں۔'' ارشد بھائی بچوں کی طرح منہ چڑا کر بولے۔ ''جس کی منگنی ہے بھئی وہ تو خوش ہولے تو ایک بات بھی ہے تم سب کیوں رشک کر رہی ہو۔''

''دیکھو ارشد! میں بڑی اماں سے شکایت کروں گی اتنی فضول باتیں کرتے ہو۔'' آپی نے دھمکی دی۔

''حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے۔'' وہ مسکرائے۔ ''بھئی ظفر! جب اپنی منگنی ہوگی تو کسی دوسرے کو خوش ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کیوں کیا رائے ہے؟''

''منگنی کے کارڈ پر لکھوا دیجئے کہ

''بغیر اجازت خوش ہونا منع ہے''

فرحت نے طنزیہ کہا۔

''منظور ہے صاحب آپ کی شرط منظور ہے بلکہ گلے گلے پانی منظور ہے۔'' وہ شرمندہ ہونے والی ہستی نہ تھے۔

''تو ارشد! میں تو تمہاری منگنی میں شرکت ہی نہ کرسکوں گا۔'' منصور بھائی نے کہا۔

''کیوں بھلا؟''

''بھئی بھائی کی منگنی سے خوشی ہونا قدرتی بات ہے مگر تم کسی کو خوشی میں شریک کرنا نہیں چاہتے۔'' منصور بھائی نے کہا۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جارہی ہو؟'' آپی نے پوچھا۔

''ہاں! ذرا سر میں درد ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پلنگ پر ایک بڑا سا گلاب کا سرخ پھول پڑا شوخی سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے اُٹھانے کو ہاتھ بڑھایا تو ایک نیلے رنگ کے کاغذ پر نظر پڑی۔ میں نے اُٹھا لیا۔ اس پر صرف یہ شعر لکھا تھا۔

اِن چمکتے ہوئے خوابوں ہی سے دامن بھرلوں سعیٔ بے سود سہی تیری تمنا کرلوں

میں تمام رات سوچتی رہی آخر یہ لکھا کس نے ہے؟ ساتھ ایک گلاب کا پھول۔ سُرخ رنگ کا۔ کیوں آخر۔ میں کیا سمجھوں۔ کیا آپ سے ذکر کروں۔ مگر نہیں نا معلوم وہ کیا سمجھیں۔ مگر یہ لکھنے والا ہے کون؟ مختلف نقوش بنتے اور بکھرتے رہے دماغ سوچتے سوچتے چکرا گیا لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ دل نامعلوم اندیشوں کی وجہ سے گھبرا رہا تھا۔ میرے اللہ! میں کیا کروں۔

صبح سو کر اٹھی تو بوا نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ لالہ نے آنے کی اطلاع بھیجی تھی۔ کوئی خاص بات تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی نا معلوم دل کیوں بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ میں نہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹر اسلم کا سامنا ہو۔ اُس دن سے جیسے ان سے ڈر سا لگنے لگا تھا کبھی کبھی تو اُلجھ سی جاتی کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ آخر ڈاکٹر نے وہ سب کیوں کہا؟ مگر شاید وہ سب یونہی ہو اور مجھے ہی سمجھنے میں غلطی لگی ہو۔ مگر پھر بھی۔ خدایا میں کیا کروں۔ اللہ کرے میں ہی غلط سمجھی ہوں۔ مگر لالہ یہاں کیوں ملنے آرہی ہے نا معلوم یہ لوگ کیا سمجھیں۔ اور جو

ڈاکٹر بھی ساتھ ہوئے تو!! اس سے آگے میرا سر چکرانے لگا۔

چار بجے لالہ ڈاکٹر کی خوبصورت سی کار میں آئی۔ اُسے اکیلا دیکھ کر میں نے شکر کیا۔

''ہیلو روبی ڈیئر!'' وہ مجھ سے چمٹ گئی۔

''ہیلو لالہ! اچھی تو ہیں اب آپ؟''

''مجھے نہیں پتہ۔ بڑی بے مروّت ہو۔'' وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

''وہ کیوں بھلا؟''

''میں نے اتنی بار حال پوچھوایا۔ لکھ کر بھی بھیجا مگر تم نے زبانی تک کہلوا کر نہ بھیجا۔''

''مگر لالہ! ڈاکٹر نے ایک بار بھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ میں نے خود پوچھا تھا کہ طبیعت کیسی ہے۔ لیکن آپ کی کوئی تحریر مجھے نہیں ملی۔''

''بس یہ بھیا تو......'' انھوں نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اچھے تو ہیں ڈاکٹر؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''بس پاگل ہونے میں تھوڑی سی کسر باقی ہے۔'' وہ مسکرائیں۔

''کیا مطلب؟''

''برا نہ ماننا مگر کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ کاش تم بھیا سے نہ ملی ہوتیں وہ یوں کھو گئے ہیں جیسے دنیا میں صرف تم ہی تم ہو۔''

''لالہ—'' میں نے بہ مشکل دھڑکنوں پر قابو پایا۔

''کل میں نے کہا۔ اللہ کرے روبی دوبارہ بیمار ہوجائے اور یہ بیماری خاصی لمبی ہو تو کھوئے انداز میں کہنے لگے ''یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی بیماری سے مجھے دکھ ہوگا یا خوشی۔ اس کی تکلیف کا دکھ۔ اور اس سے ملنے کی خوشی۔ میں خود بھی فیصلہ نہیں کرسکتا'' وہ اتنے سنجیدہ تھے کہ میں بھی ہنسی ضبط نہ کرسکی۔''

''مگر لالہ—'' میرا دماغ کھول رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے سے ضربیں لگا رہا ہو تو ڈاکٹر یہ سمجھتے ہیں۔

چند لمحات خاموشی رہی۔ ایک دم میں نے ارادہ کیا کہ ڈاکٹر کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔

''لالہ! سُنو۔ ڈاکٹر ہیں نا۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر۔ وہ جو کچھ سمجھتے ہیں۔'' میری بات بے ربط سی تھی۔

''وہ جو کچھ سمجھتے ہیں وہ صحیح ہے۔'' لالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ساتھ ہی آپی اندر آئیں۔

مجھے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔ کتنی مجبوری ہے۔ نہ ہی کچھ کہہ سکوں اور کہے بن رہ نہ سکوں۔ الٰہی! یہ زندگی میں اتنی ساری الجھنیں کہاں سے آ گئیں۔

''روبی! سوگئیں کیا۔ ہمارا تعارف تو کرادو۔'' لالہ شگفتگی سے مسکرائیں۔

''اوہ—'' میں چونکی۔ ''یہ لالہ ہیں ڈاکٹر اسلم کی بہن اور یہ آپا رضیہ ہیں نواب صاحب کی صاحبزادی۔''

''روبی! تم اتنی کھوئی سی کیوں ہو؟'' آپی نے پوچھا۔

''نہیں تو آپی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

لالہ پھر ہنس پڑی۔

کچھ نہ کہنا بھی تو اک طرز بیاں ہوتا ہے

تھوڑی دیر بعد آپی چلی گئیں۔ میں نے لالہ کو چائے میں لگائے رکھنا چاہا۔ مگر بات نہ بن سکی۔

''ہاں تو روبی! تم کب آؤ گی ہمارے ہاں؟''

''جب پاپا آجائیں گے۔''

''تب تو ہم لے ہی آئیں گے۔'' نامعلوم وہ کیا سمجھیں۔

''اوہ— میرا مطلب تھا پاپا کی غیر موجودگی میں میرا آپ کے ہاں جانا مناسب نہیں۔''

''پاپا کی غیر موجودگی میں تو واقعی یہ غیر مناسب ہے مگر تم میری سہیلی بن کر

آنا۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی۔

''مگر لالہ! آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔نواب صاحب کے ہاں رہتے ہوئے میں کہیں آنا جانا نہیں چاہتی۔ یہاں رہ کر میں اپنے آپ کو اُسی رنگ میں رنگ لینا چاہتی ہوں جو یہاں کے ماحول کا ہے۔'' میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

''ارر—رر ذرا آہستہ۔ ذرا آہستہ سمجھ گئی ہوں۔'' لالہ شرارتاً مسکرائیں۔

''اوہ—'' میرا رونے کو جی چاہنے لگا۔

''کیا ہوا روبی ڈارلنگ!''

''کچھ نہیں ذرا سر میں درد ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''ہوں— یہ بھیا کو بلانے والا درد تو نہیں؟'' شرارت ان کی رگ رگ سے پھوٹ رہی تھی۔

''کیوں کیا راج گڑھ میں اور کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟'' میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

''مگر بھیا جیسا علاج کون کرے گا؟''

''اونہہ! بھلا سر درد کے لیے بھی ڈاکٹر بلائے جاتے ہیں۔''

''اور جو سر درد ہی ڈاکٹر کے بلانے کا بہانہ ہو۔''

''میں خاموش رہی۔

''اپنی تصویریں دکھاؤ۔''

''میں نے کبھی تصویر ہی نہیں اتروائی۔'' میں نے سو فیصد جھوٹ بولا۔

''اور یہ البم کیسا ہے؟''

میں بھول گئی تھی کہ البم باہر ہی پڑا ہے۔

''صرف یہ تصویریں دے دو۔'' لالہ چند تصویریں اتار کر بولیں۔

''مگر میرا یہ اصول ہے کہ جب تک میں نے وہ جگہ چھوڑنی نہ ہو اپنی تصویر کسی کو نہ دوں۔ لہٰذا جب راج گڑھ چھوڑ کر جاؤں گی اس وقت دے جاؤں گی۔''

''میری قسم ہے جو نہ دو۔''

''مگر—''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ سیدھی طرح لکھو اوپر۔'' انھوں نے میرے ہاتھ میں پین دے دیا اور مجھے اوپر with Love لکھتے ہی بن پڑی۔

''اب یہ بھیا کو دوں گی کہ روبی نے دی ہے۔'' یہ تصویر پرس میں رکھتے ہوئے بولیں۔

''لیکن لالہ! یہ زیادتی ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''اچھا چلو اس کا تعویذ بنا کر ان کے گلے میں ڈال دوں گی۔''

''مجھے نہیں پتہ۔'' میرا موڈ بگڑ گیا۔

''یہ تو مذاق تھا اور تم روٹھ گئیں۔ لو اب مان جاؤ۔'' انھوں نے اتنے پیار سے مجھے سینے سے لگایا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ آہستہ سے انھوں نے اپنے ہونٹ میری پیشانی پر رکھ دیئے۔ میں کچھ شرم سے پیچھے ہٹ گئی۔

''یہ میں ہوں اسلم بھیا نہیں۔ پھر شرمانا کیسا؟''

مغرب کے وقت لالہ چلی گئی۔

نماز کے بعد میں نے صدق دل سے ڈاکٹر اسلم کی وہاں سے تبدیلی کی دعا مانگی۔ رات کے کھانے کے بعد اپنے کپڑے ٹھیک کئے بس لیٹی ہی تھی کہ سب آ گئے۔

''تیاری ہوگئی؟'' آپی نے پوچھا

''تیاری کیا تھی بس کپڑے ہی تو ٹھیک کرنے تھے۔''

''ابا حضور کا فون آیا ہے کہ پرسوں کی بجائے کل چلو تا کہ پرسوں وہاں پہنچ سکو۔ لہٰذا کل صبح ۹ بجے کی گاڑی سے جانا ہے۔'' منصور بھیا نے کہا۔

''اور وہ دھوبی کم بخت کہیں گیا ہوا ہے۔ دھوبن بیمار ہے کپڑے کیسے استری ہوں گے؟'' ارشد بھائی کچھ فکر مند تھے۔

''روبی کی استری باہر پڑی ہے بس سب کام ابھی ہوا جاتا ہے۔'' آپی نے کہا۔

رات ۱۲ بجے تک تیاری ہوتی رہی۔

''اور وہ ہمارے سوئیٹر؟'' اچانک ظفر بھائی بولے۔

''وہ تو مکمل ہی نہیں ہوسکے۔'' میں نے سوکھا ہوا سا منہ بنا کر الماری کھولتے ہوئے کہا۔

''سچ؟'' منصور بھائی چونک پڑے۔

''جی سچ!'' میں نے سوئیٹر انھیں تھما دیئے۔ سوائے ارشد بھائی کے سب نے اشتیاق سے لے لیے۔

''میں نے پہلی مرتبہ آپ کو مذاق کرتے دیکھا ہے۔'' منصور بھائی بولے۔

''اور بھائی ارشد کا سوئیٹر؟'' ظفر بھائی نے پوچھا۔

''بوا سی رہی ہیں۔''

''اب بتایئے شکریہ کس طرح ادا کیا جائے؟'' منصور بھائی نے ہنس کر پوچھا۔

''سر کے بل کھڑے ہو کر۔'' نسیم بھائی نے تجویز پیش کی۔

''میں تو بھئی بوا کا ممنون ہوں۔''

''نامعلوم ارشد بھائی اُداس سے تھے یا مجھے ہی ان کا لہجہ اُداس لگا۔

''شکریئے کے جھمیلے میں کام رک جائے گا۔'' میں نے کہا۔

بارہ بجے لیٹے اور بس پلک جھپکتے ہی صبح ہوگئی۔ اس قدر افرا تفری مچی ہوئی تھی کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہورہی تھی کہ اتنا لمبا سفر اس حالت میں کیسے گذرے گا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بس ٹرین ہلنے ہی والی ہے۔ حالانکہ صرف سات بجے تھے اور ہم ابھی گھر ہی تھے۔

آپی کے سٹپٹائے حکم پر میں نے جلدی سے اتنی سردی میں نہا کر کپڑے بدل لیے۔

ناشتے کے بعد فرخندہ میرے پاس آئیں۔

''روبی! تم نے آسمانی کپڑے کیوں پہن لیے؟''

''آپ نے بھی تو یہی رنگ پہن رکھا ہے۔''

''میرا مطلب تھا کہ ہلکا رنگ سفر میں جلد گندا ہوجاتا ہے بدل ڈالو نا۔'' اس

نے کچھ اتنے التجا آمیز لہجے میں کہا کہ میں نے ہاں کہہ دی اور جا کر اپنے پسندیدہ Purpul رنگ کے کپڑے پہن لیے۔

سامان باہر جا چکا تھا۔ آپی اور فرحت گھر بند کرا رہی تھیں۔ میمونہ اور میں باہر نکلیں تو فرخندہ سامنے ہی تھی۔ ''لیجئے میں کپڑے بدل آئی۔''

''ہوں۔ مگر یہ رنگ۔'' وہ کچھ گھبرا رہی تھی۔

''مگر یہ رنگ تو میلا نہ ہوگا یہ میرا پسندیدہ رنگ ہے۔''

میں حیران تھی کہ اتنی معمولی بات پر وہ ایسے کیوں کہہ رہی ہے۔ لیکن ایک بات میں نوٹ کئے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ معمول سے بہت زیادہ سجی بنی تھی۔ بہت سا زیور پہن رکھا تھا۔ اور کسی قدر مجھ پر مہربان بھی تھی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کیوں؟

سب بھائیوں پر بری طرح غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ سوال کار کے ڈرائیو کرنے کا تھا۔ ڈرائیور نواب صاحب کے ساتھ جا چکا تھا۔

''بھئی میں تو قطعاً کار نہ چلا سکوں گا۔ سخت نیند آ رہی ہے۔'' منصور بھائی آنکھیں بند کئے ہوئے بولے۔

''نیند سے تو میرا بھی برا حال ہے۔'' ظفر بھائی بولے۔

''بھئی کار چلانے والی حالت میری بھی نہیں۔ پھر پانچ میل اسٹیشن ہے۔'' ارشد بھائی نے مجبوری ظاہر کی۔

''لاؤ میں چلاتا ہوں۔'' نسیم بھائی اکڑے۔

''نہ — نہ — تم رہنے دو مجھے ایکسیڈنٹ کا شوق نہیں۔'' ارشد بھائی چلاّئے۔

''آٹھ بج گئے ہیں۔'' آپی بولیں۔

''لایئے میں ڈرائیو کروں۔'' میں نے کہا۔

''اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجعون۔'' ارشد بھائی اپنی مخصوص عادت پر اُتر آئے۔ ''میں تو اپنا چہلم اور قل کرا کے چلتا ہوں۔''

''واقعی آپ کار چلا لیتی ہیں؟'' منصور بھائی کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔

''اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کار چلانا تو ہے ہی لڑکیوں کا کام۔ میرا مطلب ہے کار چلاتی ہوئی عورت مرد سے کہیں اچھی لگتی ہے۔''

''بھلا گیرج سے پورچ تک تو لائیے۔'' نسیم بھائی امتحان لینے کے انداز میں بولے۔

''میں نے برقعہ آپی کو تھما دیا۔ اور چابی لے کر پانچ منٹ میں کار لے آئی۔

''مگر روبی! آپ کا اسٹیشن تک کار چلا کر لے جانا مناسب نہیں۔'' منصور بھائی زبردستی آنکھیں کھول کر بولے۔ بیٹھئے ارشد ڈرائیو کرے گا۔''

''ضرور۔ ضرور میں ہی ڈرائیو کرتا ہوں۔'' ارشد بھائی جلدی سے بولے

''زندگی بہت عزیز ہے آپ کو۔'' میں نے براہِ راست انھیں کہا۔

نامعلوم انھوں نے کیا جواب دیا۔ صرف چند آخری الفاظ سنائی دیئے۔ ''......مرنا تو زندگی ہے۔''

منصور بھائی کار کو اسٹیشن والوں کی تحویل میں دے کر آئے تو گاڑی چل پڑی۔

نیند سے برا حال تھا۔ دوپہر سب پڑے سوتے رہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو باقی سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''نیند پوری ہوگئی؟'' آپی نے پوچھا۔

''جی ہاں! کچھ کچھ ہو ہی گئی ہے۔''

''کیا اتنا سونے کے بعد بھی نیند پوری نہ ہوئی تھی۔'' فرخندہ نے ناک چڑھا کر کہا۔

''مجھے ارشد نے گیارہ بجے ہی جگا دیا کہ بھوک لگی ہے۔'' فرخندہ نے شکایت کی۔

''سفر میں کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا تو عین رومانی حرکت ہے۔'' ارشد بھائی نے فلسفہ بھگارا۔

''اور رومان تمہاری زندگی میں داخل ہے۔'' نسیم بھائی بھی چہکے۔

''رومان میری زندگی ہے نسیم!'' ارشد بھائی وجد میں آ کر بولے۔ ''میری زندگی کی بنیاد ہی رومان پر رکھی گئی ہے۔''

''کیا شادی کی محرک بھی یہی چیز ہوگی؟'' منصور بھائی مسکرا کر بولے۔

''کہہ نہیں سکتا۔'' ارشد بھائی سنجیدہ تھے۔ ''کہنے والے کہتے ہیں کہ شادی رومان کی موت ہے لیکن شادی میرے ارمانوں کی زندگی ہے۔''

''بڑے سنجیدہ ہو کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' ظفر بھائی مزاحیہ سنجیدگی سے بولے۔

''ارے یار طبیعت کا نہ پوچھ زوروں پر ہے۔ بس درست رومان تو وہاں ختم ہوجاتا ہے جہاں بچے آجاتے ہیں لیکن پھر بھی خواہش ہے کہ میرے اتنے زیادہ بچے ہوں۔ کہ۔ کہ۔''

مذاق میں انھیں کوئی مثال بھی نہ سوجھی۔

''مثلاً کتنے؟''

''یہی کوئی ایک درجن لڑکیاں اور ایک درجن لڑکے۔'' وہ منہ بنا کر بولے۔

''ارشد! یہ انتہائی غیر رومانی حرکت ہے۔'' نسیم بھائی نے ٹانگیں پھیلائیں۔

''غیر رومانی حرکت ہے۔'' ارشد بھائی منہ چڑا کر بولے۔ ''تم دیسی لوگ رومان کو اتنا محدود کیوں کر دیتے ہو۔ انگلش ادب میں اس کے معنی بہت وسیع ہیں۔''

''اور تم اصلی انگریز ہو؟'' آپی چڑانے کے انداز میں بولیں۔

''بیوی بھی انگریز لانا۔'' فرحت مسکرائیں۔

''شادی کی امید کس کم بخت کو ہے۔ ہاں اگر حسن اتفاق سے میری شادی ہوئی تو جانتی ہو وہ لڑکی انگریز نہ ہوگی۔''

''خدا اس غریب لڑکی بلکہ ہماری بھابی پر رحم کرے۔'' آپی نے مصنوعی آہ بھری۔ ''ہاں بیچاری صرف چوبیس زندہ بچے اور نا معلوم کتنے مُردہ۔''

سب قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ شام تک گفتگو کے موضوع بدلتے رہے۔

''باجی! آپ کا گھر کیسا ہے؟'' میمونہ میری شال میں لپٹ کر بولی۔
''میمونہ! جو تصور جنت کا اس دنیا میں ہے وہ میرے گھر پر صادق آتا ہے۔''
''اب بھی پاپا اور گھر تمیں پہلے ہی کی طرح یاد آتے ہیں؟'' آپی نے پوچھا۔
''آپی! یاد تو بھولے ہوؤں کو کیا کرتے ہیں۔'' میری آواز بھرا گئی۔
''آپ کو پاپا سے بہت پیار ہے۔'' منصور بھائی نے پوچھا۔
''پاپا ایک ہی وقت میں میرے لیے ماں اور باپ ہیں۔ میں نے ان سے ماں کی مامتا اور باپ کی محبت دونوں پائی ہیں۔''
''آپ کو اپنی ممی کا کچھ بھی یاد نہیں؟''
''کچھ بھی نہیں۔ ایک تو میں بہت ہی چھوٹی تھی جب ان کا انتقال ہوا۔ دوسرے پاپا نے کبھی ان کی کمی ہی محسوس ہونے ہی نہیں دی۔''
''چلیے اب تو قت گذر ہی جائے گا۔''
''جی ہاں! خدا انھیں خیریت سے لے آئے۔ میں اس انتظار کی تکلیف کو کبھی یاد بھی نہیں کروں گی۔''
''تمھیں ہمارے ہاں کوئی تکلیف ہے روبی؟'' آپی نے گلہ کیا۔
''اُف! آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ یہ تو روحانی تکلیف ہے۔ اور روحانی تصورات میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں کبھی نہیں آتیں۔''
''اس طرح تمھیں ان سے جدا رہنے کی عادت پڑ جائے گی۔'' فرحت نے کہا۔
''اللہ نہ کرے مجھے پھر کبھی ان سے جدا ہونا پڑے۔
''کیوں دولہا بھائی گھر داماد بنیں گے؟'' فرحت شرارت سے مسکرائی۔
''مجھے اب ان سے صرف موت جدا کرے گی۔''
''پھر تو فرحت نے ٹھیک ہی کہا ہے۔'' آپی نے شریر مسکراہٹ سے کہا۔
میں چپ رہی۔
''پچھلے دنوں ممتاز چچا کا جو خط آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ آپ کو وہاں

بلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' منصور بھائی نے کہا۔

''جی ہاں اُنہوں نے مجھے لکھا تھا۔ مگر میرا خیال ہے یہ میرا دل بہلانے کے ہے۔ وہ مجھے کیسے بلا سکتے ہیں۔''

''میرے ایک دوست طاہر ہیں وہ آپ کو جانتے ہیں؟'' ظفر بھائی نے بات بدلی۔

''جی ہاں! وہ ناز کے بھیا ہیں۔ ان کا ہمارے ہاں بہت آنا جانا ہے۔''

''اور وہ ناز کی منگنی کا کیا ہوا؟'' آپی کو ایک دم یاد آیا۔

''فی الحال تو کوئی اطلاع نہیں آئی۔''

''آپ کا جانے کو تو جی چاہتا ہوگا؟'' نسیم بھائی نے پوچھا۔

''یہ تو ظاہر ہے۔ میں نے پاپا کو لکھا ہے۔ وہ وہاں سے اجازت بھیج دیں گے۔''

رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہم صبح پانچ بجے کے قریب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ ہمیں لینے کے لیے کار کھڑی تھی۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے کوٹ بھی نہ پہنا ہوا تھا اس لیے کچھ زیادہ محسوس کر رہی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد ہم ''اختر لاج'' پہنچ گئے۔ ابھی فجر کا وقت تھا۔ مگر وہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ وسیع گراؤنڈ میں شامیانے لگے تھے جن میں جا بجا بلب جل رہے تھے۔ برآمدے میں بالکل اندھیرا تھا۔

اندر سے کوئی لمبا سیاہ کوٹ پہنے نکلا۔ ساتھ ہی برآمدے کے بلب جلنے لگے۔ میں دانستہ پیچھے کھڑی تھی۔

''ہیلو منصور!'' آنے والا دوڑ کر بھائی منصور سے لپٹ گیا۔

سب بھائیوں سے مل رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ باتوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

''اماں یار! ابھی تو بارات آنے میں پانچ دن باقی ہیں اور مہمانوں کا یہ حال ہے۔'' ارشد بھائی شامیانوں کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

''ارشد بھائی نے آتے ہی دُکھتی رگ چھیڑی ہے۔ خدا کی قسم عزیزوں کے عزیز

اور پھر ان کے بھی عزیز آ گئے ہیں۔ تمھارے آنے سے پہلے نامعلوم کون سے نواب صاحب آئے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے بچوں کی فوج ساتھ ہے۔ کم از کم چوبیس تو ہوں گے۔''

ظفر بھائی قہقہہ لگا کر بولے۔''انھیں ارشد سے ضرور ملوا دو۔ سارا راستہ سر کھاتا آیا ہے کہ میرے بھی چوبیس بچے ہوں اچھا ہے ان کا حشر دیکھ لے۔ شاید توبہ ہی کر لے۔ اور ذرا کم تعداد کے لیے یہ وظیفہ جاری رکھے۔''

''یہ اب مبالغہ ہے۔'' نسیم بھائی نے ارشد کی طرفداری کی۔

''صبح ہونے دو ان کے فرشتے بھی توبہ کریں گے۔ اگر ڈیڑھ سو سے کم بچے اس گھر میں ہوں تو چور کی سزا وہ میری۔ وہ سر جھکا کر بولے۔

''مگر میں تم سب سے ناراض ہوں۔ عین وقت پر آ گئے ہو جب سب کام ہو چکا ہے۔''

''چلو ہم تمہاری ٹانگیں دبا دیں گے۔'' منصور بھائی نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''وہ تو تمھیں کرنا پڑے گا'' وہ چونکے۔''اور ہاں وہ ممتاز صاحب کی بچی نہیں آئیں؟''

''آئی ہیں۔ یہیں تو تھیں۔'' منصور بھائی چونکے۔

''یہ بچے بھی غائب ہونے میں دیر نہیں کرتے۔ اتنے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور پھر اِدھر اُدھر غائب ہو جاتے ہیں۔ حد ہے بھئی۔''

''کہاں گئیں روبی؟'' آپی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

''جی آپی!'' میں آگے نکل آئی۔

''یہ روبی ہیں ممتاز چچا کی بیٹی اور یہ اختر ہیں میرے ماموں زاد بھائی۔'' منصور بھائی نے تعارف کرایا۔

''تسلیم!'' میں نے کہا۔

مگر اختر بھائی ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بلب کی روشنی میرے چہرے پر آ گئی۔ وہ اتنا گھبرا گئے کہ میرے سلام کا جواب تک نہ دے سکے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں تو جاتے ہی لیٹ گئی۔ مگر نہ جانے کیوں دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں مگر ان کی آواز میں بھی ترنم اور موسیقی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے۔ جیسے بادلوں پر اُڑ رہی ہوں۔ اختر بھائی کا چہرہ نامعلوم اتنا کیوں مانوس سا لگتا تھا۔ جیسے اس سے پہلے بھی انھیں بارہا دیکھا ہو۔ مگر کہاں۔ کس دنیا میں؟ شاید تصورات میں۔ انھیں حسین تصورات کی رنگیں وادیوں میں کھو کر سوگئی۔

رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح دن چڑھے تک سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقی پلنگ خالی تھے مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ اتنی دیر تک سونا سراسر حماقت تھی مگر نیند پر کم از کم مجھے اختیار نہ تھا۔

غسل خانہ میں سے آپی نکلیں۔

''نیند پوری ہوگئی روبی؟''

''جی ہاں! میں بہت دیر تک سوتی رہی ہوں۔''

''نہیں ہم سب بھی ابھی اُٹھے ہیں۔ بس جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ غسل خانے میں گرم پانی رکھا ہے۔ جلدی کرو۔''

وہ بال سنوارتی ہوئی بولیں۔ آپی فرحت اور فرخندہ تیار ہو چکی تھیں۔ میں نے بھی جلدی جلدی کپڑے بدل لیے اور فرحت اور فرخندہ انتظار نہ کرسکیں لیکن آپی میرے لیے کھڑی رہیں۔

''آپی! آپ جائیے مجھے دیر لگ جائے۔''

''اچھا! مگر تم گھبرا نہ جاؤ گی۔'' میں پندرہ منٹ میں سب سے مل کر تمھیں لینے آجاؤں گی۔''

''شکریہ!''

میں پندرہ منٹ میں بہ مشکل تیار ہوسکی مگر آپی نہ آئیں۔ اکیلے کچھ طبیعت گھبرا سی گئی۔ میں پردہ اٹھا کر برآمدے میں آگئی۔ دور کے کمروں میں شور سنائی دے رہا تھا۔

اس جگہ کوئی نہ تھا۔ نامعلوم سب کہاں تھے۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہورہی تھی۔ میں نے خواہ مخواہ ہی آپی کو بھیج دیا۔ نامعلوم وہ اب کہاں ہوں۔ اتنے بڑے گھر میں انھیں ڈھونڈنا بھی تو آسان نہیں۔ پھر خواہ مخواہ جھانکتے پھرنا بھی کچھ یونہی سا ہے۔

''صبح بخیر۔''

کسی نے اچانک میرے قریب آ کر کہا۔ میں بری طرح چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اختر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''اوہ۔'' میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''میں نے صبح بخیر کہا تھا۔مگر جواب نہیں ملا۔'' وہ مسلسل مسکرا رہے تھے۔

''جی رات میں نے بھی سلام عرض کیا تھا مگر جواب نہیں ملا۔'' میں نے بھی اسی طرح جواب دیا۔

''اوہو۔تو یہ بدلہ اتارا جارہا ہے۔''

''جی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔''کیا آپ بتا سکتے ہیں آپی اس وقت کہاں ہیں؟''

''ناشتہ کررہی ہوں گی۔آپ نہیں گئیں ناشتہ کے لیے؟''

''جی نہیں مجھے کچھ دیر ہوگئی۔''

ساتھ ہی آپی آ گئیں۔

''تو رضیہ! اسکیم تیار ہے نا؟''

اختر ایک دم ان کی طرف مُڑے اور معنی خیز لہجے میں بولے۔

''بالکل آپ دیکھئے تو۔آؤ روبی! ناشتہ کرلو۔''

میں ان کے ساتھ ہولی۔ اس کمرے میں کچھ ہی لوگ بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا۔لیکن مجھے تعجب سا ہوا کہ فرحت اور فرخندہ تو رہیں ایک طرف آپی نے بھی نہ ہی میرا تعارف کسی سے کرایا اور نہ ہی یہ ظاہر کیا کہ وہ میرے ساتھ ہیں۔ میں گھبرائی سی کھڑی تھی کہ آپی نے ایک لڑکی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر میرے پاس آ گئیں۔

''آپ شفو آپا کی سسرال سے آئی ہیں؟'' انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''جی—؟'' میری حیرانگی بڑھتی گئی۔ میں نے گھبرا کر آپی کی طرف دیکھا۔مگر وہ اسی طرح کھڑی رہیں۔

''آپ کا نام؟''

''روبی۔'' مجھے اتنی شرم آرہی تھی کہ ان لوگوں نے مجھے ساتھ لا کر یوں شرمندہ کرنا تھا۔تو پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ چائے کی طرف دیکھنے کو بھی نہ جی چاہتا تھا مگر پینا ہی پڑی۔اُف! وہ مجبوریاں۔

''ارے ہاں رضیہ! وہ ممتاز چچا کی بچی کو ناشتہ نہیں بھیجا؟'' اس اجنبی لڑکی نے کہا۔

''اوہو! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔''

میں نے گھبرا کر آپی کی طرف دیکھا۔

''لاؤ اب دے آتی ہوں۔''

''اس کی آیا تو ساتھ ہوگی نا؟'' وہ پھر بولیں۔''بہر حال مجھے بچوں کے ناشتہ کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ کچھ بڑی تو ہوگی ہی۔''

''ہاں کچھ ہے ہی۔''

''اب مجھے کچھ سمجھ آیا یہ سب کچھ کسی مجوزہ اسکیم کے تحت ہو رہا تھا۔ غالباً اختر اس اسکیم کے محرک تھے۔

''آپ نے بتایا ہی نہیں آپ ڈاکٹر بھیا کی کیا لگتی ہیں؟''

''میں ڈاکٹر صاحب کی کچھ نہیں لگتی۔ میں تو آپا رضیہ کو ڈھونڈنے آئی ہوں جو نواب صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ سُنا تھا وہ یہاں مل سکیں گی۔'' میں نے منہ بنا کر مذاق میں حصہ لیا۔آپی سے زیادہ اداکاری نہ ہوسکی وہ بھی ہنس پڑیں۔

''بڑی خراب ہیں آپ۔'' میں نے گلہ کیا۔

''واہ! اتنی جلدی گھبرا گئیں۔''

’’آپی! اگر مجھے اس اسکیم میں شریک ہونا ہوتا تو یہ اتنی جلدی ناکام نہ ہوجاتی۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’اچھا! اب تعارف بھی خود کراؤ۔ یہ ثریا ہیں اور یہ شفو آپا دلہن بی۔‘‘ آپی نے ہنس کر کہا۔

’’مجھے روبی کہتے ہیں۔ اور میں آپ کے چچا ممتاز کی لڑکی ہوں۔‘‘

’’واقعی؟‘‘

’’آپ کو اس میں شک ہے؟‘‘

’’نہیں تو۔ مگر ہمارے تصور میں ایک چھوٹی سی بچی تھی۔‘‘ شفو آپا نے کہا۔

’’یہ سب اختر بھائی کے ایما پر ہوا ہے۔‘‘ آپی نے کہنا شروع کیا۔ ’’رات وہ بھی روبی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ اُنھوں نے ہمیں بھی اس اسکیم میں شریک کرلیا۔ کہ آپ کو بھی ذرا پریشان کیا جائے۔‘‘

’’مگر تعجب تو یہ ہے کہ آپ سب لوگ مجھے بچہ کیوں سمجھ رہے تھے۔ غالباً میری پیدائش کی اطلاع تو آپ کو ملی ہوگی۔ تو اس کے بعد بڑا بھی ہونا تھا۔‘‘ میں نے یوں کہا جیسے بڑا ہونا کوئی جرم تھا۔

’’یہ تو ہے ہی روبی۔ مگر تصور وقت کے ساتھ بڑھتا اور گھٹتا نہیں۔ تصور کسی حقیقت کی طرح نہیں ہے۔ حقیقت میں تم بڑی ہوتی گئیں۔ مگر ہمارے خیالات میں تمھارا تصور بچے ہی کا رہا۔‘‘ ثریا نے بڑے عالمانہ انداز میں کہا۔

’’چھیا! اب جا کر کام کرو۔‘‘ شفو آپا نے ثریا سے کہا۔

’’آپا! آپ تو اب دلہن ہیں مگر کام کا اسی طرح احساس ہے۔ بے فکر رہیے ڈاکٹر بھیا کو تکلیف نہ ہوگی۔‘‘ فرحت مسکرائیں۔

’’چلو واقعی ماموں جان سے مل کر کام کریں۔ چلو روبی! تم بھی۔‘‘

میں ان کے ساتھ ہولی۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

نواب صاحب بڑے پیار سے ملے۔

''سلیمان! یہ روبی ہے اپنے ممتاز کی بچی۔''

میں نے سلام کرتے ہوئے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی اختر کے ابا نہ لگتے تھے۔ صرف رنگ ایک سا تھا۔ جسم بے حد بھاری تھا۔ بڑی خطرناک مونچھیں تھیں۔ مجھے ویسے بھی ازلی بیر ہے ہر قسم کی مونچھوں سے۔

اُنھوں نے حقے کی نے ہٹا کر مجھے بڑے غور سے دیکھ کر شفقت سے سلام کا جواب دیا۔

''خدا رکھے اب تو بڑی ہوگئی ہے۔ ممتاز کب واپس آ رہے ہیں؟''

''جی! جب کام ختم ہوجائے گا آ جائیں گے۔''

''رضیہ بھئی! اب کچھ کام میں مدد دو۔ بارات آنے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ یہ فرحت اور فرخندہ تو ہیں ہی اول نمبر کی کام چور۔''

''واہ ماموں جی! میں نے بھلا کب کام نہ کیا۔'' فرحت لاڈ سے بولیں۔

''اچھا بتاؤ تو صبح سے کیا کیا ہے ہماری بیٹی نے؟''

''صبح سے تو بہت کام کر رہی ہوں۔ پہلے اُٹھ کر نماز پڑھی۔ پھر تیار ہوئی۔ پھر ناشتہ کیا۔ اور اسی پر بس نہیں اب آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''چلو اب باہر چلتے ہیں۔'' فرخندہ بولیں۔

''روبی! ذرا اختر کو میرے پاس بھیج دینا۔'' سلیمان ماموں نے پیچھے سے آواز دی۔

''بہت اچھا۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

فرحت اور فرخندہ بڑی تیزی سے قدم اٹھا کر ہم سے آگے نکل گئیں۔

''روبی! ذرا سُنیئے۔'' منصور بھائی کسی برآمدے میں سے برآمد ہوئے۔

''فرمایئے۔''

''رضیہ! واقعی عین وقت پر آنا ہماری حماقت تھی۔ ہم نے ذرا بھی کام نہیں کیا۔

اختر کام کی زیادتی کی وجہ سے آج ٹھیک نہیں۔ مجھے تو ڈر ہے اسے کہیں بخار نہ ہو جائے۔ ہمیں اب پورا کام اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ باقی سب بھی کام کر کے تھک چکے ہیں۔''

''باقیوں کا بہت فکر ہے آپ کو۔ کیوں نہ ہو ثریا بھی تو تھک گئی ہیں۔'' آپی اپنے مخصوص تبسم سے بولیں۔

منصور بھائی پر اس مذاق کا اثر دیکھنے کے لیے میں نے ان کی طرف دیکھا۔ مگر وہ گھبرائے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔ نامعلوم کیوں؟

''رضو! مذاق ہٹاؤ اور سنجیدگی سے سنو۔ ہاں روبی! ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''جو یقیناً آپ کو حاصل رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آج دوپہر کے کھانے سے انتظام میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ہر قسم کی تفصیلات آپ اختر سے لے لیجئے مردوں کا باہر میں دیکھ لوں گا۔ عورتوں کو آپ جانئے۔''

''کوئی اسسٹنٹ نہیں ملے گا منصور بھیا؟'' میں نے مذاق کیا۔

''فرخندہ اور فرحت ہی ہیں۔ مگر ان سے کام کی اُمید کم ہی ہے۔ میں اور اختر بھی اکیلے ہی تھے۔ مگر ہمارا دوست سلیم آ گیا ہے۔ باقی سب تو جیسے ہیں بس دل ہی جانتا ہے۔''

وہ ہمیں ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوئے۔ اختر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ چہرے کا رنگ زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک دم اُٹھ بیٹھے۔ منصور بھیا نے ساری بات سمجھا دی۔

''منصور! رضیہ بھی تو فرخندہ اور فرحت ہی کی طرح ہیں۔ مگر تمھیں ان پر زیادہ بھروسہ اور اعتماد ہے پھر ان سے زیادہ پیار ہے بھی ہے۔ کیوں؟''

''اختر! فرخندہ اور فرحت میری بہنیں ہیں۔ لیکن رضیہ اور میں بھائی بہن ہونے کے علاوہ دوست بھی ہیں۔ مخلص دوست۔ کیوں رضو؟''

''منصور بھیا! آپ میرے لیے بہت کچھ ہیں۔''

''بھئی اختر! ان کا مہمانوں سے غائبانہ تعارف تو کرادو۔ تاکہ یہ کام کی نفسیاتی نوعیت تو سمجھ سکیں۔''

''سب سے پہلے تو یہ کہنا ہے کہ ثریا کو زیادہ تکلیف نہ دیں۔ وہ تقریباً پچھلے آٹھ دن سے شفو کے پاس بیٹھ ہی نہ سکی۔ اور اسی لیے وہ اداس اور بیزار ہے۔ میرے کمرے کے ساتھ ہی مہمانوں کے کمرے شروع ہوتے ہیں۔ ساتھ والے کمرے میں نواب شجاع الدولہ مقیم ہیں۔ ان کی بیوی کو پان کی تکلیف دینے سے پہلے خود اپنا بیمہ کرالیجئے۔ اور ہاں ان کے بچوں کی تعداد دیکھ کر ''ماشاء اللہ'' بھی نہ کہئے۔ وہ برا مانتی ہیں۔ اس کے بعد—— اور اس کے بعد۔''

اسی طرح آدھ گھنٹہ میں ہمیں تقریباً ہر مہمان کی عادات کا پتہ چل گیا۔

''آپ کو ماموں جی بلا رہے تھے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔ ہاں میرا خیال ہے آپ دونوں ایک طرف نہ رہیں۔ اک ادھر رہئے۔ اور دوسری دوسرے طرف کے مہمانوں کی دیکھ بھال کرے۔''

میں اور آپی کھانے کے وسیع پنڈال میں داخل ہوئے۔ دوپہر کے کھانے تک بہ مشکل تمام کام ہوسکا۔ اور اس وقت تک میں نے کھانا تقسیم نہ ہونے دیا جب تک سب مہمان بیٹھ نہ گئیں۔ مشرقی حصے کے مہمانوں کا انتظام میرے سپرد تھا۔ اور مغربی حصے کا آپی کے سپرد۔ چونکہ کھانے کا انتظام ہوٹل والوں کے سپرد تھا۔ اس لیے باقاعدہ رجسٹروں میں انتظام کرنا تھا۔ میں آپی کو ڈھونڈنے نکلی۔ اور وہ بہ مشکل مل سکیں۔

''آپی! اتنی سرخ کیوں ہورہی ہیں؟''

''نہیں تو۔'' ان کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

''تم نے کھانا کھالیا؟''

''جی نہیں۔''

کھانے کے دوران میں یہ محسوس کئے بغیر میں نہ رہ سکی کہ وہ خلاف معمول کچھ

کھوئی کھوئی سی تھیں۔ بس یوں ہی سا کھایا۔

''آپی! ہوا کیا ہے آخر؟''

''کچھ نہیں روبی!'' انھوں نے اپنا سر میرے کندھے سے لگالیا۔ ان کی شفیق آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''آپی! میری آپی!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کیا بات ہوئی ہے۔ کیا آپ کو مجھ سے اتنا پیار بھی نہیں جو مجھے بتا سکیں۔''

''روبی! خدا گواہ ہے تم مجھے اپنی جان سے زیادہ ہو۔ مگر آج کا واقعہ میں تمھیں کیسے بتاؤں۔ مگر نہیں تو تم میری اپنی ہو۔ بالکل اپنی۔ تمہاری آنکھوں میں میں نے آج وہ چمک دیکھی ہے جو صرف خلوص ہی ہے۔'' وہ رُکیں۔ ''روبی! ابھی میں رجسٹر رکھنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں گئی تو کرسی پر بیٹھا کوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے منصور بھیا سمجھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے پیچھے سے جا کر سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور جانتی ہو کیا ہوا۔ وہ منصور نہ تھے۔''

''اور کون تھا؟''

''نامعلوم کون۔ میرے سگریٹ کھینچنے پر وہ ہڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ بہ مشکل معذرت کرسکی۔'' آپ کو مجھ پر منصور کا دھوکہ ہوا ہے۔ آپ ان کی بہن ہیں؟'' انھوں نے پوچھا۔ میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ انھوں نے مجھے پانی دیا۔ جسے پی کر بھی میرے حواس درست نہ ہوئے۔ ''آپ اتنا گھبرائی ہوئی ہیں بیٹھ جایئے۔'' انھوں نے کرسی دی۔ ''جی نہیں مجھے کام ہے۔ مگر دیکھئے منصور بھیا سے اس کا ذکر نہ کیجئے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بہت اچھا۔ مگر کیوں؟'' وہ دیکھئے نا۔ پھر مجھے شرم آئے گی۔'' اور وہ ہنس پڑے۔ ''جیسا حکم۔ صرف یہ یاد رکھئے گا کہ مجھے سلیم کہتے ہیں اور مجھے منصور کے دوست ہونے کا فخر حاصل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔'' آپی کی نظریں خلاؤں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

''تو اب گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

''یہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں روبی! مگر نامعلوم کیوں میرے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہیں۔ نہ جانے مجھے کیا محسوس ہورہا ہے۔ جیسے مجھے کوئی خوابوں کے جزیرے میں لے گیا ہو۔ جہاں موسیقی ہے زندگی ہے۔ جہاں سرسراتی ہواؤں کے لیے پرندے گنگناتے ہوئے آتے ہیں۔ جہاں اَن جانا۔ اَن بوجھا سرور ہے۔'' آپی کچھ کھو سی گئیں۔

میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محبت انسان کو فلسفی بھی بنا دیتی ہے۔

''اب کیا ہوگا روبی؟''

''ہوگا کیا۔ شہنائیاں بجیں گی۔ اور پھر آپی انھیں پُر اسرار جزیروں میں چلی جائیں گی۔ جہاں موسیقی ہے۔ سرور ہے۔ زندگی ہے۔''

''روبی! تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہونا۔ میں نے بھی نامعلوم کیا کیا کہہ دیا ہے۔''

''مگر آپی! ایسے پاگل بھی ہمیشہ ہوش کی باتیں کرتے ہیں۔ چلیے باہر جا کر ذرا چائے کا سلسلہ دیکھ آئیں۔''

''تم جاؤ روبی! میرا جی نہیں چاہتا۔ ابھی آ جاؤں گی۔''

''نہ آیئے۔ میں جا کر سلیم بھیا سے کہہ دوں گی کہ آپی بلا رہی ہیں۔''

''روبی! تمھیں میری قسم جو کہو۔''

''اچھی آپی! آپ مذاق کو بھی نہیں سمجھتیں۔ اچھا ذرا میں حساب کتاب لکھ آؤں۔ آپ اتنی دیر آرام کیجئے۔''

میں باہر آ گئی۔ مغلانی منیجر کا پرچہ لیے پھر رہی تھی کہ کس وقت چائے چاہیئے اور باقی ہدایات۔ میں نے جواب لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ کی ضرورت محسوس کی۔ فرحت اور فرخندہ کے گانے کی آواز دور کے کمروں سے آ رہی تھی۔ سب بھائی باہر تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اختر کے کمرے میں چلی گئی۔ میز پر قلم اور کاغذ پڑے تھے۔ میں نے تفصیل سے سب کچھ لکھ کر مغلانی کو دے دیا۔ اور کھانے کا حساب لکھنے لگی۔

میرا قلم چلتے چلتے رک گیا۔ سامنے اختر کی تصویر پڑی مسکرا رہی تھی۔ میں جدھر بھی مُڑتی یوں محسوس ہوتا اختر کی نظریں بھی ادھر ہی مُڑ جاتی ہیں۔ میرا چہرہ میرے ہاتھوں

میں تھا۔ اور کہنیاں میز پر۔ نامعلوم کون کون سے خیالات میرے دماغ میں سے گذرتے رہے اور نہ جانے کیوں آنکھوں میں آنسو جمع ہوتے گئے۔ مگر میں نے انھیں گرنے نہ دیا۔ اختر کی تصویر مسلسل مسکرائے جارہی تھی۔ شاید تصویر پر کچھ گرد تھی۔ یا میرے آنسوؤں کی وجہ سے وہ دھندلی نظر آرہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے ڈوپٹے سے صاف کردیا۔

''میں دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں۔ مگر آپ اس قدر محو تھیں کہ میری دستک تک نہیں سُن سکیں۔''

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اختر میرے پاس ہی کھڑے مسکرا رہے تھے بس جان ہی تو نکل گئی۔ ان کے چہرے پر وہی تصویر والی مسکراہٹ تھی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اور وہ آنکھوں کا پانی میری پلکوں پر آرہا۔ میرا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ میں نے دونوں ہاتھ دھڑکتے ہوئے دل پر رکھ لیے۔ کسی کے سانس کی ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اختر کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔

وہ مسکرائے اور سگریٹ کا دھواں میرے چہرے پر پھیل گیا۔

''آپ چوری کرنے آئی ہیں۔'' اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

''اتنا بڑا الزام دینے سے پہلے آپ اپنے کمرے کی ہر چیز دیکھ لیجئے۔''

''مگر آپ چوری کی نیت سے آئی ہیں۔'' وہ مصر رہے۔

''یہ نہ بھولیے کہ آپ میری توہین کر رہے ہیں۔''

''ناراض نہ ہوئیے۔ کئی چور اتنے بھولے ہوتے ہیں کہ خود اپنی نیت کو بھی نہیں جانتے۔''

''پھر بھی کیا چرایا ہے میں نے آپ کا؟'' میری آواز شدّتِ غم سے تھرّا گئی۔

''کوئی مادی چیز تو نہیں۔ اور نہ میں اس چیز کا نام لے سکتا ہوں۔ مگر میرا کچھ کھو ضرور گیا ہے اور میں نے بھی کچھ پالیا ہے۔'' ان کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ بہ مشکل میں سن

سکی۔ اختر کا ہاتھ دیوار پر تھا۔ اور اس طرح ان کے بازو سے بنے ہوئے محراب کے نیچے میں کھڑی تھی۔ میری پلکیں آنسوؤں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں۔

''کیا یہ آنسو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ اپنا جرم مانتی ہیں؟''

''میری زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقعہ ہے کہ کسی نے مجھ پر چوری کا الزام لگایا ہے اور وہ بھی محض یہ سمجھتے ہوئے کہ میں یہاں بے بس ہوں۔''

''یہ نہ کہئے کہ یہ الزام پہلا ہے۔ یہ کہئے کہ یہ الزام لگانے کی جرأت پہلی ہے۔ ہوسکتا ہے کئی اور لوگوں کو آپ سے یہی شکایت ہو۔''

''اختر بھیا! یہ مت بھولیے کہ مجھے کسی چیز کی کمی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ جو مجھے کچھ چرانے کی ضرورت پیش آتی۔ آپ اپنے مہمانوں کی اسی طرح عزت کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کا احساس نہ تھا۔'' غصہ عروج پر تھا۔ اور میں اسی حالت میں چل پڑی۔

''ذرا سُنئے یہ سب تو مذاق تھا۔ اور آپ ناراض ہوگئیں۔''

بعض مذاق بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔''

''خدا کرے اس کا اثر بھیانک نہ ہو۔'' اختر بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے میری نظریں خود بخود جھکتی گئیں دو تین منٹ وہ لگاتار مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ کچھ گھبرا کر میں وہاں سے ہٹی اور دروازے تک پہنچ گئی۔ کہ اختر جھٹ میرے سامنے آ کر سرگوشی کے لہجے میں بولے۔

''میرا سچ مچ کھو گیا ہے۔''

میں جلدی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

برات آنے میں صرف ایک رات باقی تھی۔ اس دوران میں میں نے اختر کو شاذ ہی دیکھا۔ اندر کی مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ ایک دفعہ وہ نظر بھی آئے مگر میں دانستہ کترا گئی۔ دراصل مجھے کچھ غصہ سا تھا۔ اس رات کھانے کے بعد اصل کام شروع ہوا۔ سب مہمان سونے کے لیے چلے گئے تو بارات کے استقبال اور رہائش وغیرہ کی دیکھ بھال شروع ہوگئی۔ شامیانوں میں جگہ جگہ بلب جل رہے تھے۔ سب بھائی گیٹ سے باہر سڑک

اور اسٹیشن کے درمیانی حصے کو سجانے میں مصروف تھے۔ ہم سب اندر کام کر رہی تھیں۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب باہر کام ختم ہوگیا۔ فرحت اور فرخندہ تھک کر سو چکی تھیں۔ ثریا سیڑھیوں پر سے گرجانے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر نے انھیں آٹھ دن تک آرام کرنے کو کہا تھا۔ چونکہ بارات صبح پہلی گاڑی سے پہنچ رہی تھی۔ اس لیے میں اور آپی برتن لگا رہے تھے۔ دور اختر اور منصور بھائی میں کسی اہم مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ منصور بھائی تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔

''ذرا سُنئے تو۔''

''فرمایئے۔''

''ثریا کی علالت کی وجہ سے کام کا زیادہ بوجھ آپ کے کندھوں پر پڑ رہا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے آپ اسے اپنا ہی کام سمجھیں گی۔ اس وقت ایک مسئلہ درپیش ہے۔ صبح بارات کے ساتھ بیس عورتیں آ رہی ہیں۔ آپ کو ان کا انتظام کرنا ہوگا۔ ایسا کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ خصوصاً ان کی رہائش اور کھانے پر توجہ دیں پوری برات کے کھانے کا انتظام میزوں پر ہے۔ مگر آپ جانتی ہیں ہمارے گھرانے میں یہ طریقہ نہیں ہے اس لیے آپ کی قابلیت کا امتحان چاہیئے۔''

''کتنے نمبر لے کر پاس کرنا ہوگا اس امتحان میں؟'' آپی میز کی چادر بچھاتے ہوئے بولیں۔

''سو فی صد۔'' اختر بولے۔ ''مجھے افسوس ہے مِس ممتاز! کہ آپ مہمان ہیں اور میں آپ کو اتنی تکلیف دے رہا ہوں دراصل میں نہیں چاہتا کہ کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں ہمارے خاندانی معالجوں کی وجہ سے شفو کو اپنی سسرال میں شرمندہ ہونا پڑے۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ کئی لوگ دوسروں کو صرف تکلیف ہی دے سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک میں ہوں۔''

''کام سے مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ زندگی کا حسن ہے۔ ہاں آپ کے اس طرح کہنے سے شاید ہوئی ہو۔''

''روبی! آپ کو یہ کام اس لیے دیا گیا ہے کہ آپ اس کی اہل ہیں۔ رضیہ کو اپنے ساتھ رکھیں۔ مگر کسی سے اس بات کا ذکر نہ کریں۔ تنگ نظری کی وجہ سے حقیقت بدل جاتی ہے۔''

''آپ مطمئن رہیے منصور بھیا! خدا کرے میں اس کام کو خوش اسلوبی سے نباہ سکوں۔''

''اررــــ سلیم باہر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' منصور بھائی چونکے۔ ''اختر! تم لیٹ جاؤ یا کم از کم بیٹھ تو ضرور ہی جاؤ۔''

''رضو! ذرا پانی دینا۔'' اختر نے آپی سے کہا۔

وہ منصور بھیا کے ساتھ ہی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اختر کی آنکھیں بند تھیں۔ اور چہرہ تمتما رہا تھا۔

''آپ نے کوٹ کیوں نہیں پہنا۔ ہوا اتنی سرد ہے۔'' وہ آنکھیں کھول کر بولے۔

''آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ میں نے ان کا سوال نظر انداز کر دیا۔

وہ اپنا سوال دہراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔

''یونہی۔ کوٹ پہن کر آسانی سے کام نہیں ہوتا۔''

''کام آپ کی صحت سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ یہ آپ کو ماننا پڑے گا۔''

''میں یہ مانتی ہوں مگر بعض اوقات بعض حالات میں کام صحت سے مقدم ہوتے ہیں۔ یہ آپ کو بھی ماننا پڑے گا۔''

''کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟'' میں نے انھیں خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں دو روز سے بخار ہے۔''

''اوہ! مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔ بہرحال آپ جا کر لیٹ جایئے کام آپ کی منشاء کے مطابق ہوگا۔ آپ کی صحت اس کام سے زیادہ اہم ہے۔''

''مگر بعض اوقات بعض حالات میں کام صحت سے مقدم ہوتے ہیں۔ ہے نا؟''

انھوں نے میرے الفاظ دہرا دیئے۔

آپی اندر داخل ہوئیں تو ان کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جو پہلے دن سلیم

بھیا کو دیکھ کر پیدا ہوئے تھے۔

منصور بھیا نے آ کر زبردستی اختر کو ان کے کمرے میں بھیج دیا۔ میں نے دیکھا چلتے ہوئے ان کے پاؤں کسی قدر لڑکھڑا رہے تھے۔ میری نظریں اس وقت تک ان کا تعاقب کرتی رہیں جب تک وہ نظر آتے رہے۔

رات دو بجے جب میں اور آپی لیٹے تو نیند کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ تھکاوٹ سے بُرا حال ہورہا تھا۔ چونکہ نیند کا وقت گذر چکا تھا اس لیے عجیب بیکلی تھی۔ آپی سیدھی لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''آپی! چھت کے ساتھ کس کا تصور وابستہ ہے جو اسے اس قدر محویت سے دیکھا جارہا ہے۔''

''کچھ نہیں روبی! طبیعت اداس اور پریشان ہے۔''

''کام کی زیادتی تو اس کا سبب نہیں ہوسکتی۔''

''روبی! میں پانی لینے گئی تو آگے سلیم کھڑے تھے۔'' آپی نے یوں کہنا شروع کیا جیسے میری بات ہی نہ سنی ہو۔

''انھوں نے سلام کیا۔ مگر میں بغیر جواب دیئے چلی گئی۔ نامعلوم میرا دل کیوں ڈوب رہا ہے۔ یہ کیا ہوگیا ہے مجھے؟''

''واہ آپی! اتنی جلدی دور کی منزلوں پر پہنچ جاتی ہیں آپ۔ پہلے مجھے سلیم بھیا کو دیکھ لینے دیجیے۔ پھر بتاؤں گی کہ وہ میری پیاری آپی کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔''

''ہٹو روبی! ایسے ہی اندیشے تو مجھے پریشان کئے ہوئے ہیں۔''

''اگر میں مدد کروں تو کیا دیجیے گا؟''

''تم کر ہی کیا سکتی ہو؟''

''بہت کچھ۔ منصور بھیا سے کہہ کر......''

''نہیں روبی! خدا کے لیے نہیں۔'' انھوں نے گھبرا کر میری بات کاٹی۔

''آپی! میں بچہ تو نہیں ہوں کہ منصور بھیا سے یونہی جا کر کہہ دوں گی۔ دعا

کیجیے خدا کوئی نادر موقعہ دے دے تاکہ یہ بات میں ان سے کہہ سکوں۔''

آپی نامعلوم میری آواز سے متاثر ہوئیں یا اس کے اثر سے کہ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

تھوڑی دیر بعد مجھے تو نیند آ گئی۔ بہ مشکل تین گھنٹے سو سکی تھی کہ آپی نے جگا دیا۔ چھ بجے برات گھر پہنچ رہی تھی۔ سب اُسے لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ آپی اور میں گھر ہی رہ رہے تھے۔ ناشتے کا تمام کام دیکھ کر میں غسل خانہ میں گئی ہی تھی کہ باجے کی آواز آنی شروع ہوگئی۔ جلدی جلدی تیار ہوئی۔ مگر میرے تیار ہو چکنے کے بعد بھی برات گھر میں داخل نہ ہوئی۔ باہر کئی رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔

سب سے پہلے منصور بھیا آئے۔

''روبی! سب ٹھیک ہے نا؟''

''جی بالکل۔''

''مہمان خواتین دوسرے دروازے سے آ رہی ہیں۔ آپ ان کے استقبال کے لیے اُدھر چلی جائیں اور انھیں ان کے کمروں تک پہنچا دیں۔''

میں نے ان کے کہنے کے مطابق سب کر دیا۔ مشکل سے دس بجے تک مہمانوں نے ناشتہ کا لامتناہی سلسلہ ختم کیا اور ساتھ ہی نکاح کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ سب شفو آپا کے پاس بیٹھے تھے ان کی سسکیوں میں بڑا درد تھا۔ باقی سب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

نکاح کے بعد مبارک سلامت کا فلک شگاف شور بلند ہوا۔ اس تمام افراتفری میں اختر بالکل نظر نہ آئے جب شفو آپا اور ثریا اکیلی رہ گئیں تو میں نے انھیں اندر جاتے دیکھا۔ آپی کچھ دیر بعد میرے پاس آ گئیں۔

''چلو ذرا شفو کے پاس چلتے ہیں۔ تینوں بھائی بہن مل کر رو رہے ہیں۔''

میں چپ چاپ ساتھ ہولی۔ فرحت اور فرخندہ بھی وہاں بیٹھی تھیں۔ گو اس وقت اختر ہنس رہے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ ابھی ان میں آنسو تھے۔ بہن کی جدائی کے آنسو۔ میں چپ چاپ جا کر ثریا کے پاس بیٹھ گئی۔

''روبی! ادھر آپا کے پاس آ جاؤ۔''

میں اُٹھ کر شفو آپا کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اُنہوں نے مجھے ایک بادام کھانے کو دیا اور بڑی محبت سے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔

سب زور سے ہنس پڑے۔ میں کچھ گھبرا سی گئی کہ آخر اس ہنسی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ میری گھبراہٹ پر ایک اور قہقہہ پڑا۔

''بھئی بس روبی گھبرا گئی ہے۔'' شفو آپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر آپی! آخر بات کیا ہے؟ میں تو کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔''

''کیا تمھیں شادی کی تمام رسومات کا پتہ ہے؟'' ثریا نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''جی نہیں تو۔''

''یہ ایک رسم ہے کہ دلہن نکاح کے بعد جس کے سر پر ہاتھ پھیرے اس کا بیاہ فوراً ہوجاتا ہے۔''

میرا سر شرم سے جھک گیا۔ اختر باقاعدہ مسکرا رہے تھے۔ باقی تو زور سے ہنس پڑے۔

''روبی! تمھارا رنگ اس وقت خون کی طرح سُرخ ہورہا ہے۔''

''میرا خیال ہے روبی! تمھارا خون اس وقت رخساروں میں ہے۔''

ثریا کے تکلیف زیادہ تھی۔ اس لیے میں نے ان کی ٹانگ پر دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ اور ہاتھ دھونے باہر چلی آئی۔ مجھے اور آپی کو اختر بھائی کا دفتر رہنے کو ملا ہوا تھا۔ وہاں سے ہاتھ دھو کر میں اپنے مہمانوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکلنے لگی۔ تو بہت سارے آدمی نظر آ گئے۔ اس لیے مجبوراً اختر بھیا کے کمرے میں سے نکل کر جانا پڑا۔

''ذرا سُنیئے۔'' کسی نے کہا۔

اللہ! وہ اختر تھے مجھے کیا علم تھا کہ وہ کمرے میں پہنچ چکے ہیں۔

''میں ادھر سے گذرنا چاہتی تھی کچھ لوگ کھڑے ہیں نا اس لیے۔''

''میں نے کب کچھ کہا ہے کہ آپ کیوں آئی ہیں۔ پھر میں نے رضو سے بھی کہا

تھا کہ وہ دروازہ بند کردو۔ کیونکہ ادھر سے آدمی گذرتے ہیں۔''

''مگر پھر آپ کہہ دیں گے کہ میں چوری کرنے آتی ہوں۔''

وہ صرف مسکرادیئے اور تھرما میٹر لگا کر دیکھنے لگے۔

میرے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''شکر ہے آپ نے پوچھا تو۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر تھرما میٹر ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس وقت بخار ایک سو دو تھا۔

''باہر گیا تھا مگر منصور اور دولہا بھائی نے زبردستی اندر لیٹنے کو بھیج دیا ہے۔ لیکن میرا دل بستر کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا۔''

دونوں تکیئے کرسی سے اٹھا کر میں نے پلنگ پر رکھ دیئے اور چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''لیٹ جایئے نا۔''

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے ہوئے لیٹ گئے۔ میں نے آہستہ سے انھیں لحاف اُڑھا دیا۔

''کب تک لیٹنے کا حکم ہے؟''

''جب تک میں نہ آجاؤں۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد تک مجھے قطعاً فرصت نہ ملی۔ مجھے محسوس ہورہا تھا کہ جیسے میری روح کو آرام کی ضرورت ہے۔ دولہا بھائی کی بہنیں تو میری دوست بن گئیں۔ اٹھنے ہی نہ دے رہی تھیں۔ جب وہ شفو آپا کے پاس گئیں تو میں تھوڑی دیر رانی ماں کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ منصور بھیا برآمدے میں سے نکل رہے تھے۔

''آج کل بڑا کام کرنا پڑ رہا ہے آپ کو۔'' وہ مسکرائے۔

''بھیا! کام تو کچھ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ ہاں اسے خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر ضرور

پیش کیا جارہا ہے۔'' ارشد بھائی کو مدت کے بعد طنز کا موقع ملا تھا۔

''روبی! آپ ارشد کا برا نہ مانا کریں۔''

''آپ باہر جارہے ہیں؟'' میں نے محض ان کی بات کا جواب نہ دینے کے لیے سوال کیا۔

''ہوں! اختر کو لینے آیا تھا۔ وہ اٹھ ہی نہیں رہا۔ کہاں تو منتیں کر کے لیٹنے کو بھیجا تھا۔ کہاں وہ کہہ رہا ہے کہ ٹھہر کر آؤں گا۔''

منصور بھیا کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے مُڑی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں کھول کر اندر چلی گئی۔ سب لوگ دوبارہ کپڑے بدل چکے تھے۔ مگر میرا دل صرف لیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ آپی نے اصرار کر کے دوسرے کپڑے پہننے کو بھیجا تھا۔ اس لیے مجبوراً میں نے نہایت ہلکے پھلکے سرسراتے ہوئے آسمانی کپڑے پہن لیے۔ باہر جانا چاہا تو دروازہ پھر بند تھا۔ لہٰذا مجھے قطعاً نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ والے کمرے سے گذرنا پڑا۔

''آپ آ گئیں۔'' اختر کی آواز میں گلہ تھا۔

''جی!''

''آپ کا حکم تھا نا کہ جب تک آپ آنا جائیں۔ میں لیٹا رہوں۔''

''اوہ— مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔''

''سچ مچ!'' ان کی آواز اُداسیوں میں کھوگئی۔

''میں معذرت چاہتی ہوں دراصل— نامعلوم کیوں بھول گئی۔ آپ برا نہ مانئے۔''

''نہیں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔ مگر اچھا ہوتا آپ مجھ سے نہ کہتیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا تھا۔ کیا اب اٹھ سکتا ہوں؟''

''جی ضرور۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اتنے ہلکے پھلکے کپڑے پہن کر آپ بلندیوں پر سے اترتی ہوئی محسوس ہوتی

ہیں۔ مجھے آسمانی اور جامنی— رنگ بہت پسند ہیں۔‘‘

مجھے ایک دم فرخندہ یاد آئی جو میرے آسمانی اور جامنی— دونوں رنگ کے کپڑوں کو دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔

میں چپ چاپ باہر آ گئی۔ بارات اسی رات واپس جارہی تھی۔ اس گھرانہ میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ بارات چار دن سے کم ٹھہرے۔ مگر باوجود اصرار کے ڈاکٹر بھیا نہ مانے کیونکہ انھیں صرف آٹھ دن کی چھٹی ملی تھی۔ اور وہ اسی میں ہنی مون منانے جارہے تھے۔ آپا شفو کی نندوں نے مجھے بلوا بھیجا۔

’’روبی! کہاں چلی گئی تھیں تم۔ تمھارا ذکر ہورہا تھا۔ مگر تم نہ تھیں۔‘‘ باجی زاہدہ نے کہا۔

’’جی ہاں وہ جو کہتے ہیں نا ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

’’روبی! خدا کی قسم اگر میرا کوئی دوسرا بھائی ہوتا تو میری بھابی یقیناً تم ہوتیں۔‘‘ ریحانہ باجی نے کہا۔

’’ریحانہ باجی! آپ تو یہ کہہ رہی ہیں۔ مگر میں لڑکا ہوتا تو سوائے روبی کے کسی سے شادی نہ کرتا۔‘‘ جمیلہ کے مردانہ لہجے پر ہنسی کا طوفان اٹھا۔

’’روبی! اتنے ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیے ہیں تم نے۔ ہم تو فرخندہ ہی کو کہہ رہے تھے کہ جب سے آئی ہو آسمانی رنگ کے پیچھے پڑی ہو۔ مگر اس کے کپڑے تو بھاری کام والے ہوتے ہیں۔ تم تو بالکل گڑیا بن آئی ہو۔‘‘

’’مجھے ایسے ڈھیلے ڈھالے ہلکے کپڑے بہت پسند ہیں۔‘‘

’’روبی! تمھارا یہ رنگ بڑا Suit کرتا ہے۔‘‘ شفو آپا نے آہستہ سے کہا۔

رات دس بجے بارات رخصت ہوئی اس قدر شور تھا کہ کچھ سمجھنا یا سمجھانا بھی فضول تھا۔ اختر نہ چاہتے ہوئے بھی اداس تھے۔ جب شفو آپا ان سے رخصت ہوئیں تو سب کے آنسو نکل آئے انھوں نے بڑے ضبط سے دعائیں دے کر بہن کو رخصت کیا اور

ہونٹوں کو کاٹتے رہے۔ ثریا کا تو رو رو کر برا حال تھا۔

بارات آہستہ آہستہ نظروں سے دور ہوتی گئی۔ چاروں طرف یوں خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہ تمام شور آپا شفو کے ہی دم سے تھا۔

میں برآمدے سے اُتری تو سلیمان ماموں نظر آ گئے جو بڑی محویت سے مجھے تک رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نامعلوم کون سا جذبہ تھا کہ میرا تمام جسم کانپ کر رہ گیا۔

''بہت کام کرنا پڑ رہا ہے آج کل۔'' انھوں نے بھاری آواز میں کہا۔

''جی نہیں تو۔'' وہ اپنے ہاتھ سے میرا رخسار تھپتھپا کر چلے گئے۔

''کیا ہوا روبی! آپ کچھ گھبرائی ہوئی ہیں۔'' منصور بھیا نامعلوم کب آ گئے تھے۔

''کچھ نہیں بھیا۔ میں ڈر گئی تھی۔''

''اوہ! چلیے میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آؤں۔''

''چلیے۔''

''کتنی خاموشی چھا گئی ہے۔ اور کتنا سکون ہے اس خاموشی میں۔ اختر کتنا خوش نصیب ہے جو اپنی بہن کو اتنے اچھے ساتھی کے ساتھ رخصت کر سکا ہے۔ کاش! میں بھی رضو کے لیے کچھ کر سکتا۔'' منصور بھیا جذباتی ہو رہے تھے۔

''آپ کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

''روبی! آپ ایک بھائی کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ہمارے خاندان میں کوئی بھی اس قابل نہیں کہ رضو کا ہاتھ اسے دے سکوں۔''

''اختر بھیا نے بھی تو اپنے دوست ہی کو اپنی بہن دی ہے۔ کیا آپ کا کوئی دوست اس قابل نہیں ہے؟'' مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ موضوعِ سخن خود بخود اچھی طرف جا رہا تھا۔

''ہو بھی تو میں رضو کی مرضی کے بغیر کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ میں اس بارے میں کچھ آزاد قسم کی رائے رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ رضو کے لیے اس شخص کا انتخاب کروں جسے وہ خود بھی پسند کرے۔''

''آپ کے دوست— سلیم صاحب کیسے ہیں؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''سلیم بہت اچھا ہے اور رضو کے قابل بھی۔ مگر......'' وہ کچھ چونک پڑے تھے۔

''تو کیا آپ اس سلسلے میں کچھ نہ کریں گے؟'' مجھے اپنی جرأت پر خود حیرت تھی۔

''کیا رضو نے کبھی سلیم کو دیکھا ہے؟'' وہ بے حد حیران تھے۔

''شاید۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

''اوہ—'' انھوں نے گہری سانس لی۔ ''روبی! آج آپ نے مجھے وہ راہ دکھائی ہے جو رضو کی کامیاب زندگی کی طرف جاتی ہے۔ میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔''

''منصور!'' اختر بھیا نے آواز دی۔ "Excuse me" وہ مجھے دیکھ کر بولے۔

''منصور! ابا تمھیں بلا رہے ہیں''

''روبی! آپ چلی جائیں گی نا۔ اب تو ڈر نہیں لگتا؟''

''جی نہیں شکریہ۔'' میں جلدی سے وہاں سے ہٹ آئی۔

اختر کا چہرہ ان کے احساسات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اور ان کے چہرے پر صرف شکوک اور غصہ تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی آپی بیٹھی تھیں۔

''آپی—'' میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا روبی؟''

''لڈو کھلایئے تو بتاؤں۔''

''ایسی کون سی بات ہوگئی ہے کہ لڈو کھانے تک نوبت پہنچ گئی۔''

''وعدہ کریں تو بتاؤں۔''

''اچھا وعدہ سہی۔''

''جب میں نے انھیں بتایا تو ان کی آنکھوں میں موتی ڈھلک آئے۔ ''روبی!

تم کتنی اچھی ہو۔''

''بس سلیم بھیا سے ذرا کم۔'' ضبط کے باوجود میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ نامعلوم کس مقدس جذبہ کے تحت۔

''روبی! ایک اور خوشخبری ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پہلے لڈو کھلاؤ تو بتاؤں۔'' انھوں نے میرا ہی طریقہ اختیار کیا۔

''اچھا کھلا دوں گی بتایئے نا۔'' میں نے منت کی۔

''منصور بھیا کی شادی ہورہی ہے۔'' آپی نے ایک دم کہا۔

''جی!'' میں اس بری طرح چونکی جیسے اس خبر کے لیے تیار ہی نہ تھی۔

''دیوان خانے میں بات چیت ہورہی ہے۔'' آپی میرے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے چلی گئیں۔

رات بھیگ چکی تھی۔ مگر تھکاوٹ کی وجہ سے نیند بھی نہ آرہی تھی۔ رہ رہ کر اختر کا چہرہ میرے سامنے آرہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں شکوک اور رنج کے ملے جلے تاثرات تھے۔ مگر شک والی بات ہی کون سی تھی۔ منصور بھیا کے ساتھ مجھے دیکھ کر نامعلوم وہ کیا سمجھے۔ حالانکہ کچھ ایسی بات نہ تھی۔ اور نہ ہی انھوں نے مجھے کچھ کہا تھا۔ مگر دل پر ان کے بوجھ کا رنج تھا۔ انھی خیالات اور پریشانی میں مجھے نیند نے دنیا سے دور کردیا۔ مگر جن کا خیال مجھے پریشان کئے ہوئے تھا وہ خواب میں بھی اپنے اداس اور شکوک والے چہرے کو لیے موجود تھے۔ صبح کافی دیر لیٹی رہی۔ میرے اُٹھنے سے پہلے دور کے کچھ عزیز رخصت بھی ہوگئے۔ مگر اس سے کچھ خاص فرق نہ پڑ سکا۔ شور وغل اتنا ہی تھا۔

بادلوں کی وجہ سے ابھی سویرا ہی لگتا تھا۔ ہوا بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر کا حصہ بڑا ہی دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔ نامعلوم موسم کا اثر تھا یا کچھ اور وجہ۔ گنگنانے کو دل چاہ رہا تھا۔ مگر باہر برآمدے میں آمدورفت جاری تھی۔ بادل نخواستہ اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ باہر آئی تو آپی بستر ٹھیک کر رہی تھیں۔

''صبح بخیر آپی!''

''صبح بخیر۔'' وہ ہنس پڑیں۔ ''نو بجنے والے ہیں؟''

''سچ؟''

''ہوں۔ ہر شخص کم از کم بیس مرتبہ پوچھ چکا ہے روبی کہاں ہے۔ ابھی منصور اور اختر بھیا جارہے تھے تو منصور بھیا نے مجھے بھیجا کہ دیکھوں کہ روبی کی طبیعت ہی خراب نہ ہو۔''

''رات آپ کب آئی تھیں؟''

''آدھی رات کے بعد۔'' وہ کسی قدر اُداس ہوگئیں۔

''رات بڑی بےلطفی رہی۔ میری طبیعت ابھی تک پریشان ہے۔''

''کیا ہوا تھا آپی؟''

''روبی! ہمارا شروع سے یہ خیال تھا کہ منصور بھیا کے لیے ثریا کو مانگ لیں گے جبکہ ساتھ ہی یہ بات بھی حقیقت کی طرح مانی جاتی تھی کہ سلیمان ماموں کی بہو فرخندہ ہی ہوگی۔''

''پھر— کیا ہوا؟'' نامعلوم کیوں میرا دل دھڑک کر رہ گیا۔

''مگر رات ماموں جی نے کہا کہ اختر فی الحال شادی کرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے وہ سامنے آمنے کی شادی کے خلاف ہے آپ کے اختیار میں ہے چاہے منصور کے لیے ثریا لے جایئے یا فرخو ہمیں دے جایئے— ہم سب حیران تھے کہ کیا کہیں۔ منصور نے اختر سے خود بات کی۔ اب صرف منصور بھیا کی شادی کے لیے ہاں ہوئی ہے۔ ماموں کہہ رہے تھے اختر جب بھی شادی کرے گا فرخندہ ہی میری بہو بن کر آئے گی۔''

''پھر— آپی! پریشانی کی کون سی بات ہے؟''

''منصور بھیا ایک رات میں آدھے بھی نہیں رہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولے۔ ''رضو! مجھے اپنی بہنوں پر سے قربان ہوجانے دو'' میں تو حیران تھی بھیا کا اس سے کیا مطلب ہے۔''

''آپ نے پوچھا نہیں؟''

''پوچھا تھا۔'' انھوں نے گہرا سانس لیا۔ ''انھوں نے مجھے کہا۔ ''اختر نے مجھ سے کہا ہے کہ منصور! تم میرے خلوص کو سمجھتے ہو۔ خدا کی قسم فرخندہ مجھے بہن کی طرح عزیز ہے۔ مگر میں اسے بیوی نہیں بنا سکتا۔ برا نہ ماننا منصور! میں تمھیں دکھ نہیں دینا چاہتا۔ لیکن یہ بات میں کسی اور سے نہیں کہہ سکتا۔ تم مجھے سمجھتے ہو منصور! مجھے تم پر بڑا مان ہے۔ میرا مان نہ توڑنا—'' روبی! میں منصور بھیا کے لیے کچھ بھی نہ کرسکوں گی۔''

''پھر—؟'' میری آواز کانپ رہی تھی۔

''بھیا کے دل میں اختر بھائی کے لیے قدر بڑھ گئی ہے۔ میرے دل میں بھی ان کا پیار دوگنا ہوگیا ہے۔ انھوں نے بڑی صفائی سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ مگر ہمارے علاوہ کسی کو اس بات کا علم نہیں۔ اسی لیے ماما کہہ رہے تھے کہ اختر کا بیاہ فرخندہ ہی سے ہوگا۔ مگر روبی!— میرے بھیا۔''

''آپی! آپ رک کیوں گئیں؟''

''روبی! منصور کہتے ہیں کہ ان میں اتنی طاقت اور جرأت نہیں کہ وہ بیاہ سے انکار کرسکیں۔ کیونکہ اس سے سب کو انتہائی صدمہ پہنچے گا۔ اس کے علاوہ اختر کیا یہ نہ سوچیں گے کہ ضد میں انکار کیا ہے اور کیا ماما اپنی بات نبھانے کے لیے مجبور نہ ہوجائیں گے۔ کہ فرخندہ کا بیاہ اختر سے کردیں۔ جبکہ خود اختر نے یہ بات سب کے سامنے کہی ہے کہ ایک ہی ہو تو اچھا ہے۔ چاہے منصور کا چاہے میرا۔ کسی کو اصلیت کا کیا پتہ۔ رضو! ثریا مجھے تمہاری ہی طرح عزیز ہے۔ مگر اس سے شادی کا تصور مجھے کوئی خوشی نہیں دیتا۔ یہ شادی میں صرف فرخندہ کی وجہ سے کر رہا ہوں کہ کہیں اختر کو مجبوراً اس سے شادی نہ کرنا پڑے اور وہ خوش نہ رہ سکے۔''

''مگر آپی! منصور بھیا تو مجبوراً شادی کر رہے ہیں۔''

''روبی! میں نے یہ کہا تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ وہ دوسروں کی خوشی کی خاطر اپنی جان بھی دینے کے لیے تیار ہیں۔ ثریا کو خوش دیکھنے اور اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے وہ

ہر ممکن قربانی دیں گے اور کبھی یاد نہ کریں گے کہ ان کا اپنا دل بھی ہے جس میں خوشیاں ہیں۔ جس میں ارمان ہیں۔ جس میں......'' آپی کے آنسوؤں نے بات روک دی......

''ہاں روبی! میرا بھائی فرشتہ ہی تو ہے۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ ان کی اپنی کوئی خوشی اس شادی سے پوری نہ ہوسکے گی۔ شاید انھیں کوئی اور پسند ہے۔

''اور کون پسند ہوسکتا ہے؟'' میں حیران تھی۔

''ان سے پوچھا تو بولے پسند ہو بھی تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ میرے اصرار پر بھی نہیں بتایا۔ لیکن مجھے یقین ہے انھیں کسی سے محبت ہے اور جنون کی حد تک۔''

یونہی باتیں ہوتی رہیں اور منصور بھیا اپنے مقدس اور بلند ارادوں کے ساتھ میرے خیالات میں بلندیوں پر پہنچتے گئے آپی نے ناشتہ کے لیے کہا۔ مگر میرا سر چکرا رہا تھا۔ اس لیے وہ مجھے لٹا کر چلی گئیں۔ آپی نے جو کچھ کہا تھا میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

''فرخندہ ہی اس گھر کی بہو بن کر آئے گی— مگر میں اسے بیوی نہیں بنا سکتا— مجھے اپنی بہنوں پر سے قربان ہو جانے دو— ثریا— منصور— اختر— —فرخندہ۔'' میرا دماغ پھٹنے لگا۔

''روبی!'' رانی ماں کی پیار بھری آواز نے مجھے رُلا دیا۔ اور وہ بھی نامعلوم کیوں رودیں۔

''جی!''

میں جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ وہ بھی سنبھل گئیں۔ اپنی لڑکی کی بات تھی۔ اس لیے وہ اپنے جذبات کا اظہار نہ چاہتی تھیں۔

''بڑے دنوں کے بعد اتنی فرصت ملی ہے کہ گھر کی طرح سب تمھارے پاس آ کر بیٹھیں۔''

''رانی ماں! شادی بیاہ میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے روز مرّہ کے معمولات کی پابندی کہاں ہوتی ہے۔'' میں نے دیکھا آپی ذرا دور بیٹھی تھیں۔

''رانی ماں! میرا تو واپسی والا موڈ ہوگیا ہے اب منصور بھیا کی شادی بھی تو کرنی ہے۔'' ظفر بھائی یوں بولے جیسے منصور بھیا کی شادی کا سارا فکر انہی کو تو ہے۔

''بیٹا! تیاری ہی کیا کرنی ہے سنا نہیں بیٹے کی بَری بازاری میں کھڑی۔''

''کون سے بازار میں کھڑی ہے۔ میں لپک کر لے آؤں۔ ارشد یوں جلدی سے بولے جیسے جا ہی تو رہے ہوں۔

''ارشد! خدا کے لیے کبھی تو سنجیدہ ہوجایا کرو۔'' نسیم بھائی نے ہاتھ جوڑے۔

''سنجیدہ! کیوں کیا آفت آ گئی ہے۔ کس طوفان کی آمد ہے۔ کون سی بلا میرے سر پر منڈلا رہی ہے کہیں زلزلہ یا سیلاب تو نہیں آ گیا۔ آخر ہوا کیا ہے جو سنجیدہ ہوجاؤں۔''

''ارشد! توبہ کرو۔ خدا محفوظ رکھے ہر غم سے۔''

''اماں غم تو زندگی کا حُسن ہے۔''

''تمھیں کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہہ رہے ہو۔''

''رضو! غم صرف ان لوگوں کو نہیں ہوتے جو اس کا اظہار کرنا جانتے ہیں۔ غم وہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں پلتا ہے اور آہستہ آہستہ اندر ہی اندر دل کے ساتھ ساتھ زندگی کی بنیادوں کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے۔''

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ ارشد بھائی ظاہرا لاکھ ہنتے رہیں۔ مگر وہ جانتے ہیں کہ سنجیدگی اور غم کیا ہے۔

''اماں یار! بڑی فلسفیانہ باتیں کر رہے ہو۔''

''چھوڑو بھئی۔ اپن نے تو جینا سیکھا ہے۔ اور ابھی ارمانوں کی دنیا سامنے کھڑی ہے۔ اسے پانا ہے اپنے حصے کی خوشیوں کو اس بے رحم دنیا سے چھیننا ہے۔ پھر دیکھیں گے غم کیا ہے۔''

''کل کے بچے ہو ابھی سے کیا غم اللہ کرے ساری عمر یوں ہی ہنستے کھیلتے رہو۔''

''رانی ماں! بیڈمنٹن تک تو لوگ ہنس کر کھیلتے نہیں۔ آپ تمام عمر ہنستے کھیلتے

رہنے کی دعا دے رہی ہیں۔'' ارشد بھائی زیادہ دیر مجھ پر چوٹ کئے بغیر نہ رہ سکے۔

میں نے صرف ان کی طرف دیکھا اور یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ مجھے دیکھتا پا کر وہ گھبرا ضرور جاتے ہیں۔

''ارشد! انسان بنو کبھی، منصور کو بھی دیکھا کہ وہ روبی کو تنگ کرے۔''

''اماں! منصور بھیا اور کسے تنگ کرتے ہیں۔ وہ تو بس دنیا جہاں کی تعریفیں سمیٹنے کو دنیا میں آ گئے ہیں۔''

''اور یہ منصور بھیا ہیں کہاں؟ شادی کی خوشی میں ایسے غائب ہوئے ہیں کہ نشان ہی نہیں ملتا۔ کمال ہے بھئی۔''

''شادیوں میں یہی کچھ ہوتا ہے نوٹ کرلو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم شادی کی تیاریوں کے دنوں میں ہر وقت سر پر موجود رہو۔ ہر وقت ادھر ادھر کھسکے رہنا تا کہ لوگ پوچھتے رہیں۔ ذرا پبلسٹی ہی ہوجائے۔''

''ارشد! بڑے استاد ہو۔ میں یونہی پوچھ رہا تھا۔''

''جی ہاں بالکل یونہی For The sake of general knowledge

''تم سے کون جیتے گا ارشد بیٹا! ذرا سنجیدگی اختیار کرو۔ کل کو ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں۔''

''رانی ماں! انھوں نے ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں اور بھی نہ کوئی۔'' آپی نے چڑایا — اور ارشد بھائی نے بھی بچوں کی طرح منہ چڑا دیا۔ ساتھ ہی دروازہ کھلا۔ فرحت اور فرخندہ اندر داخل ہوئیں۔

فرخندہ کے دلی احساس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ پاؤڈر کے باوجود اس کی آنکھیں رونے کی غمازی کر رہی تھیں۔

اس کے آتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اور کوئی آواز میرے کانوں میں چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

''تم مجرم ہو— تم مجرم ہو— فرخندہ کی شادی رکوانے کا سبب تم ہو۔ دوسروں

کی خوشیاں تم لوٹتی ہو۔ تم سنگدل ہو۔ تم بے رحم ہو!!''

''نہیں! نہیں!!'' میں نے پوری قوت سے چلا کر کہا۔

''کیا ہوا روبی؟'' قریباً سب چونک پڑے۔

''کچھ نہیں'' میری آواز ڈوبتی جارہی تھی صرف اتنا یاد ہے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دل کو پاؤں تلے مسل رہا ہو۔

''ظفر! خدا کے لیے منصور بھیا کو بلاؤ۔'' ارشد بھائی کی پریشانی کا سبب میری سمجھ میں نہ آیا۔

''اب کیا تکلیف ہوئی ہے اسے؟'' فرخندہ نے اتنی حقارت سے پوچھا کہ سب اسے گھور کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ آوازیں مجھ سے دور ہوتی جارہی تھیں۔ اور صورتیں دھندلی۔

جب دوبارہ آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ صرف اختر اور منصور بھیا میرے پلنگ کے گرد بیٹھے تھے۔ ذرا پرے ایک شخص شاید ڈاکٹر انجکشن کے لیے سرنج میں دوا بھر رہا تھا۔

''روبی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' منصور بھیا مجھ پر جھکے۔

''شکریہ اچھی ہوں۔''

''کیسا محسوس ہوتا ہے اب؟'' اختر بھی بولے۔ اگرچہ ان کے چہرے پر رات والے شکوک اور رنج کے تاثرات ہنوز باقی تھے۔

''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے مجھے آسمان سے کنوئیں میں دھکیل دیا ہو۔''

''آپ کا دل بے حد کمزور ہے۔ ہر قسم کے رنج اور غم سے دور رہا کریں۔'' ڈاکٹر نے انجکشن دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا طبیعت خراب ہونے سے پہلے آپ کو کوئی صدمہ پہنچا تھا؟''

''جی نہیں؟''

''نہیں— '' وہ چونکے۔ ''کیا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس نے آپ کو تکلیف دی ہو ذرا سا دکھ؟''

''جی نہیں۔''

مریضہ ابھی تک ہوش میں نہیں ہے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انھیں کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ بے ہوشی سے پہلے ان سے کون باتیں کر رہا تھا؟''

''سب ہی تھے۔'' منصور بھیا نے جواب دیا۔ ''اور بڑی ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''لیکن منصور! صبح رضیہ ان کے پاس گئی تھی۔ شاید ان کی کسی خبر سے انھیں صدمہ پہنچا ہو۔''

اختر کی بات میں سمجھ چکی تھی کہ ان کا اشارہ کس خبر کی طرف ہے۔ اسی لیے وہ آج بھی منہ پھلائے ہوئے تھے۔ مگر منصور بھیا کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔

''روضیہ روبی کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔'' انھوں نے صرف اتنا کہا۔

میں نے چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔

''انھوں نے صبح کیا کھایا تھا؟''

''سر درد کی وجہ سے ناشتہ بھی نہیں کیا۔''

''اوہ— تب ہی اتنی کمزوری ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔

''روبی! ابّا حضور آئے ہیں۔''

''نا— نا لیٹی رہو۔'' انھوں نے تسبیح ایک طرف رکھ کر میرے سینے پر پھونک ماری۔ ''میری بچی! کیا ہوا ہے تمھیں، کتنی پیلی ہوگئی ہے میری روبی۔'' ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں مگر زبردستی مسکرا رہے تھے۔

''نواب صاحب! صاحب زادے ارشد دوا لے کر بس آ ہی رہے ہوں گے۔ شام تک صاحبزادی ٹھیک ہوجائیں گی۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔'' سلیمان ماموں اندر آئے۔ مجھے دیکھ کر ان کا رنگ اور بھی سُرخ ہوگیا۔

''یہ لو مربّہ اور چاندی کے ورق۔ کھانے سے طاقت آئے گی۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولے۔

ارشد دوا لے آئے۔ وہ کسی حد تک پریشان تھے۔ حالانکہ انھیں تو میری تکلیف سے خوش ہونا چاہیے تھا۔

شام تک میری طبیعت سنبھل چکی تھی۔ نواب صاحب اس وقت تک جائے نماز سے نہ اٹھے جب تک ڈاکٹر نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہ دے دی۔

رات سب باہر مدعو تھے میزبان کو مغرب کے وقت نواب صاحب کہلوانے لگے کہ ہم نہ آسکیں گے۔

''نہیں ابا حضور! میری خاطر ایسا نہ کریں کتنا بُرا سا لگے گا۔'' میں نے کہا۔

''مگر روبی!''

''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ چلیے میں ساتھ چلتی ہوں۔''

''اچھا!'' وہ ہنس پڑے۔ مگر منصور بھیا کے کہنے پر میں گھر ہی میں رہی۔ باقی سب چلے گئے۔ کچھ دیر مغلانی میرے پاس بیٹھی رہی۔ مگر پھر میں نے اسے بھیج دیا۔ میں نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کیا ؎

ہوائے یاس کا جھونکا اِدھر نہ آجائے
کہیں چراغِ راہِ زندگی نہ بجھ جائے
وہ بدگماں کہ مجھے منزلیں قبول نہیں
مجھے یہ ڈر کہ میری جستجو نہ مٹ جائے

ان اشعار میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے دروازہ کھلنے کی بھی آواز نہ آئی اور چونکی اس وقت جب اچانک اختر کو سامنے کھڑے دیکھا۔

''آپ!'' میں گھبرا سی گئی۔ ''آپ دعوت پر نہیں گئے؟''

''نہیں مجھے ایک ضروری کام تھا۔'' دو تین لمحے خاموشی رہی— ''مس ممتاز! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' انھوں نے بڑے تکلف سے مجھے مخاطب کیا۔

''فرمائیے۔''

''دیکھیے اس بات کا کوئی اثر نہ لیجیے گا۔مگر یہ بتا دیں کہ کیا جو خبر رضیہ نے آپ کو پہنچائی ہے اس سے آپ کی یہ حالت ہوگئی ہے۔''

''کون سی خبر؟''

''آپ صاف صاف ہی سننا چاہتی ہیں تو مجھے بھی کہنے میں کوئی عذر نہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ منصور کی شادی کی خبر آپ کے لیے shock ہے؟ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کرسکتی ہیں کہ آپ کا دل اس صدمے کا متحمل نہیں ہوسکا۔''

''آپ جو کچھ بھی سمجھے ہیں وہ غلط ہے۔'' میری بھرائی ہوئی آواز کانپ رہی تھی۔ ''مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔''

''روبی! آپ نہیں سمجھتیں۔ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ میں مانتا ہوں مجھے یہ کہنے کا حق نہیں مگر میں ثریا کا بھائی ہوں۔ اور اس کے علاوہ آپ— آپ مجھے—'' انھوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''منصور بھیا سے مجھے اتنا ہی اور ایسا ہی پیار ہے جتنا ثریا کو آپ سے ہے۔ یا جتنا پیار میں اپنے سگے بھائی سے کرسکتی۔ مجھے منصور بھیا بھائی کی طرح عزیز ہیں اور ان کی شادی کی خبر میرے لیے کبھی بھی Shock نہیں ہوسکتی۔ مجھے رنج ہے کہ آپ نے مجھے اتنا گرا دیا۔

''روبی!'' وہ خوشی سے چیخے۔ ''آپ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔''

''جی ہاں! یہ تو آپ کی ہر حرکت سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرز تخاطب سے۔ ان باتوں سے۔ اس طنزیہ لہجے سے۔ ان شکوک سے۔ ان......'' میری آواز بھرا گئی۔

''روبی! خدا جانتا ہے اگر مجھے آج موقعہ نہ ملتا تو میں آپ سے یہ کبھی بھی نہ کہہ سکتا کہ آپ میری زندگی پر چھا گئی ہیں۔'' وہ رُکے۔ ''روبی!— آپ— نہیں تم

میری زندگی ہو۔ میری روح۔''

''بڑی خراب باتیں کرتے ہیں آپ۔'' میں نے منہ موڑ لیا۔

''اچھا جی۔'' وہ مسکرائے۔ ''کون سی خراب بات کہی ہے ہم نے؟''

''یہی — یہی کہ۔'' میں کہہ نہ سکی۔ اور وہ زور سے ہنس پڑے۔

''روبی! صرف یہ کہہ دو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے تمھیں اس سے اختلاف نہیں۔''

میں چپ رہی۔

انھوں نے دوبارہ کہا۔ مگر مجھ سے پھر بھی نہ بولا گیا۔

''روبی! میں مایوس ہو جاؤں؟''

''کئی باتوں کا اظہار الفاظ کی مدد کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''روبی! آج سے تمہاری خوشی میرا ایمان ہے۔ تمھارے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے لیے حکم ہوگا۔ آزما کر دیکھ لو۔''

''میں صرف ایک ہی بات کہنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ — یہ شک کرنا چھوڑ دیں۔''

''کوشش کروں گا۔ مگر روبی! تمھیں کسی کے ساتھ دیکھ کر مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ تمھیں بہت پسند کرتا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے جبکہ آپ کو یقین ہوگا کہ میں کسی کو اس طرح پسند نہیں کرتی۔''

''کس طرح پسند نہیں کرتیں۔'' انھوں نے مجھے چڑایا۔

''مجھے نہیں پتہ۔''

''روبی! تم بڑی شرمیلی ہو۔ میں کسی کو اس طرح پسند نہیں کرتی۔'' انھوں نے میری نقل اتار دی۔

''میرا مطلب تھا کسی کو اس طرح پسند نہیں کرتی۔ جس طرح آپ— کو۔''
بات پوری نہ کرسکی۔ میرے رخسار جلنے لگے۔

''اچھا روبی! یہ بتاؤ تمھیں کس بات کا صدمہ پہنچا ہے؟ ڈاکٹر کہتا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔''

''آپ نے فرخندہ سے شادی کرنے سے جو انکار کردیا ہے۔''

''لیکن تمھیں تو اس بات سے خوش ہونا چاہئے تھا۔''

''مجھے خوش ہونا چاہئے تھا! اس لیے نا کہ میں نے کسی کے خوابوں کی بستی لوٹ لی۔ کسی کی خوشیاں چھین لیں۔ کسی کے چمن میں آگ لگا دی۔ سب کے دلوں میں غم بھر دیا۔''

''روبی!'' انھوں نے لمبا سانس لیا۔ ''اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ جائز ہوتا۔ تو میرا سر تمھارے سامنے جھک جاتا۔'' وہ خاموش ہوگئے۔ ''مگر روبی! میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تمھیں دیکھنے سے پہلے بھی میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ فرخندہ میری بیوی ہوگی۔ میں پھر بھی انکار کردیتا۔''

''لیکن— مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مجرم ہوں۔''

''مجرم تو آپ ہیں۔''

''کون سا جرم کیا ہے میں نے؟''

''مجھے بلاوجہ گرفتار کرنے کا۔''

''بڑی خراب باتیں کرتے ہیں آپ۔''

''یہ تو پہلے ہی ارشاد ہو چکا ہے۔''

''دیر ہورہی ہے آپ کو جانا چاہئے۔''

''شب بخیر۔'' انھوں نے لحاف سے مجھے ڈھانپ دیا۔ اور چلے گئے۔

تمام رات الٹے سیدھے خواب دیکھتی رہی۔ صبح آپی سے باتیں کر رہی تھی کہ انھوں نے اچانک پوچھ لیا۔

''کیا رات اختر بھائی تمھارے پاس آئے تھے؟''

''جی — ؟'' میں ڈری۔ ''آئے تھے پوچھنے کے لیے کہ ڈاکٹر کا فون آیا ہے اب کیسی طبیعت ہے۔''

''اوہ! یہ بات تھی۔'' وہ مطمئن ہوگئیں۔

مگر آپی سے جھوٹ بول کر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہی رہا۔

اس روز صرف پچاس کے قریب مہمان رہ گئے تھے۔ کچھ تو اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ اور کچھ وہیں باقی عزیزوں کے ہاں چلے گئے۔ سلیمان ماموں کے بہت سے عزیز اسی جگہ رہتے تھے۔ اور ہو یوں رہا تھا کہ دوپہر کا کھانا ایک گھر میں ہوتا تھا اور رات کا دوسرے میں۔ اس روز بھی ہم دوپہر کے کھانے پر باہر مدعو تھے۔ میرا کچھ جانے والا موڈ نہ تھا۔ دراصل وہاں سب کے لیے میں کسی حد تک عجوبہ سی تھی۔ مجھے دیکھ کر عورتیں ایک دوسرے سے ضرور کچھ کہتیں اور دیر تک سرگوشیوں میں کچھ بحث ہوتی رہتی اور بحث کے خاتمہ پر مجھے بلا کر کچھ تو عجب عجب سوال کئے جاتے اور کچھ پیار ہوتا۔

بہرحال میں ان سب باتوں سے بچنا چاہتی تھی۔ اس روز جہاں دعوت تھی وہاں تو میں خاص طور پر جانا نہ چاہتی تھی۔ وہ ثریا کی رشتہ کی خالہ تھیں۔ دو ایک دن پہلے انھوں نے خاص طور پر مجھے بلا کر پیار کیا تھا۔ اور اپنے ساتھ والیوں کو اتنے فخر سے میرا نام بتایا تھا کہ میں حیران رہ گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کا کوئی لڑکا ہے۔ ''پانچویں جماعت پاس'' اور ہر لڑکی کو دیکھ کر ان کی آس بندھ جاتی ہے۔ لیکن میرے لیے ان کی توجہ اور پیار خاص قسم کا اور غیر معمولی تھا۔ اور ان صاحب بہادر کے گلے میں سونے کا بڑا سا زیور دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ اک دو دن تک تو بہنیں مجھے چھیڑتی بھی رہی تھیں۔ بلکہ آپی تو مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہتیں۔

''سونے کا کنٹھا!'' آپی — میں چڑتی اور پھر دونوں زور سے ہنس پڑتیں۔

اس وقت بھی سب بہنیں موجود تھیں۔ اور یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔

''بھئی روبی! چلو نا۔'' آپی مسکرائیں۔

''آپی! کہا نا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''جھوٹی۔ یوں کہو جانا نہیں چاہتیں۔'' فرحت نے مجھے چھیڑا۔

''ویسے داد دینے والی بات تو یہ ہے کہ انتخاب لاجواب کیا ہے۔'' فرخندہ کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اُتر گئے۔

''فرخو! پچھلے سال یہ نظر انتخاب تم پر بھی پڑ چکی ہے۔'' آپی نے بروقت میری مدد کی۔ ''وہ تو بعد میں انھیں پتہ چلا تھا— کہ'' آپی نے بات مکمل نہ کی مگر میں ان کا مطلب سمجھ چکی تھی۔

''اس انتخاب سے تو بھئی خاندان بھر کی کوئی لڑکی بھی نہیں بچ سکی۔'' فرحت نے کہا۔

''زیادہ اچھا ہوتا اگر یہ بات خاندان تک ہی محدود رہتی۔ خاندان سے باہر والی لڑکیاں ماشاء اللہ یہاں کے لڑکوں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔'' آپی کا مقصد صرف میری تعریف اور حوصلہ افزائی تھا۔

''مگر آپی! کس فخر سے کہا جاتا ہے کہ ''میرا مسعود پانچویں پاس ہے۔''

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''روبی! اب چل بھی پڑو نا۔''

''آپی! میں نہ جاؤں گی۔''

''کیوں بھلا؟''

''بھئی دوبارہ مسعود صاحب کو انھیں زیورات سے آراستہ دیکھنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔''

''روبی! اب زیور کے زیورات تو بتاؤ۔''

''ہائے اللہ وہ سونے کے بٹن۔ وہ انگوٹھیاں اور سب سے بڑھ کر وہ—''

''بڑے غور سے دیکھا ہے۔'' آپی ہنس رہی تھیں۔

''اور کیا آپی! ایسے لوگ کہیں روز روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

''روبی! اتنی ظالم نہ بنو چلی چلو۔'' فرحت نے منت کی۔

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

''اچھا اپنی کوئی چیز ہی بھیج دو۔ جسے دیکھ کر انھیں چین آتا رہے۔''

''ان کے قابل تو صرف ایک ہی چیز ہے۔ افسوس وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''کون سی چیز؟''

''جُھومر۔''

بس جو قہقہے لگنے شروع ہوئے ہیں تو باہر سے ہلکی سی ڈانٹ سنی پڑی کہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ خدا خدا کر کے سب کھانے پر چلے گئے۔ تو میں اپنے محبوب مشغلے یعنی لحاف میں لیٹ کر پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ اور نامعلوم کب تک سوتی رہتی اگر آپی نے جھنجوڑ کر جگا نہ دیا ہوتا۔

''روبی!'' ہنسی کا سیلاب تھا کہ بہا چلا آ رہا تھا۔

''روبی!'' فرحت نے بھی کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہنسی کا طوفان مچا ہوا تھا۔

''کچھ کہیئے بھی۔ کون سا زعفران کا کھیت دیکھ لیا ہے؟''

''روبی! کچھ پوچھو نہ۔ کاش تم ساتھ ہوتیں۔ اللہ قسم مسعود بھائی تو دلہنوں کو مات کیئے دے رہے تھے۔ وہ زیور — وہ کاجل۔ ہائے ہائے مگر جھومر نہ تھا۔''

''بھئی وہ تو روبی دے گی نا۔''

''کس سلسلے میں؟'' ثریا نے پوچھا۔

''منہ دکھائی کا۔''

اس کے بعد پندرہ منٹ تک قہقہوں نے بات نہ بڑھنے دی۔

''آپی نے انھیں دلہن کا خطاب دیا ہے۔ اب فرحت بھی جھومر منہ دکھائی دینے کو کہہ رہی ہے۔ حد ہے بھئی۔''

''یہ بات اختر اور ارشد بھائی کو ضرور بتائیں گے۔ وہ بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکی۔

''ان کی سرگوشیوں، قہقہوں اور اُدھر مسعود بھائی کی احمقانہ حرکتوں نے سب بھائیوں کو شک میں ڈال دیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ آخر یہی بات بتاتے ہی بن پڑی۔

''ہائے اللہ! آپی بڑی وہ ہیں آپ۔ اب مجھے شرم آئے گی نا۔''

شام تک سب نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر تنگ آ کر میں رانی ماں کے پاس جا بیٹھی اور دیر تک میمونہ کے ساتھ کھیلتی رہی۔ مگر پھر اسے فرحت نے بلا لیا۔

''روبی بیٹا! تم نے بڑا کام کیا ہے اس بیاہ میں۔ کہیں تھکاوٹ سے تو تمہاری طبیعت خراب نہیں ہوگئی۔''

''جی نہیں کام تھا ہی کیا۔ اور پھر ایسے موقعوں پر تھکاوٹ کو نہیں دیکھا جاتا۔''

''روبی! میرا تو جی خوش کر دیا ہے تم نے۔ منصور کہہ رہا تھا کہ تمام کام کا سہرا روبی کے سر ہے۔'' بڑی ماں نے کسی قدر پیار سے کہا۔

''ماں جی! میری تو انتہائی خواہش ہے کہ آپ سب کی خدمت اور عزت کرسکوں۔''

''جیتی رہو۔ خدا زندگی بھر سکھی رکھے۔'' رانی ماں نے دعا دی۔

میمونہ دور سے بھاگتی ہوئی آئی!

''باجی!''

''جی۔''

''ہمیں بھی جھومر لے دیجیے۔'' اُسے سب نے سکھا کر بھیجا تھا۔

''کیا لینے کو کہہ رہی ہے میمونہ؟'' بڑی ماں نے پوچھا۔

''جی کہہ رہی ہے گڑیا کے لیے جھومر لے دیں۔'' میں نے گھبرا کر بات بنائی۔

''اے بچی! کہیں گڑیا بھی جھومر پہنتی ہے۔ جاؤ جا کر کھیلو۔''

میں بھی میمونہ کے ساتھ ہی اٹھ آئی۔

''بڑی خراب ہیں آپ آپی!''

''خدا کی قسم روبی! میں تو منع کر رہی تھی کہ بڑی ماں کے سامنے میمونہ کو نہ بھیجو۔ مگر یہ چنڈال چوکڑی کب کسی کی مانتی ہے۔''

''چلو ہمیں سزا دے لو۔'' فرحت نے تلافی کے لیے کہا۔

''سزا کسے دوں۔ سب سے تو اتنا پیارا رشتہ ہے۔ فرحت اور فرخندہ بہنیں ہیں۔ اور ثریا۔ ثریا تو میری پاری بھابی ہیں۔''

''اونہہ۔'' ثریا نے منہ بنایا۔

''ثریا! ایمان سے منصور کی اصلی بہن تو روبی ہی ہے۔''

''روبی! تم نے بتایا ہی نہیں رضیہ تمہاری کیا ہے؟''

''آپی—؟'' میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''آپی تو میری سکھی ہیں۔''

بعض الفاظ کتنے شیریں ہوتے ہیں اور اپنا مطلب کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ مثلاً یہی لفظ سکھی۔ کتنا سکون اور مٹھاس ہے اس میں۔

مغلانی نے آ کر کہا کہ نواب صاحب کہہ رہے ہیں فوراً تیار ہو جایئے کیونکہ دعوت والا گھر وہاں سے پانچ میل پرے ہے پھر رات کو واپسی پر دیر نہ ہو جائے۔ سب کے انتہائی اصرار پر مجھے ساڑھی باندھنی پڑی۔

''آپی! میں آپ سب سے مختلف لگوں گی ساڑھی باندھ کر۔''

''روبی! یہ اختلاف تو قائم رہے گا ہی چاہے تو پھٹے ہوئے کپڑے پہن لو۔'' ''یہ رنگ۔ یہ روپ۔ یہ حسن تمھیں سب سے مختلف کر دیتا ہے۔''

''آپ تو مجھے بناتی ہیں۔''

''نہیں روبی! یہ حقیقت ہے جو شخص بھی تمھیں دیکھتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ جب پہلی بار میں نے تمھیں دیکھا ہے تو مجھے یقین ہی نہ آیا تھا کہ تم کسی انسان کی اولاد ہو۔''

''آپی! ہٹیئے بھی آپ تو مجھے کہیں سے کہیں لے گئیں۔''

''روبی! خدا کی قسم اگر میں لڑکا ہوتی تو صرف تم سے شادی کرتی۔ چاہے اس کے لیے مجھے دنیا کا کونہ کونہ چھاننا پڑتا۔''

''ذرا سنبھل کے۔ بے چارے سلیم بھیا کیا کرتے؟''

آپی ایک دم سُرخ ہوگئیں۔

''اچھا اب ساڑھی باندھ لو۔''

''آپی!'' میں نے منّت کی۔

''میری قسم روبی!''

''میں نے مجبور ہو کر سبز ساڑھی باندھ لی۔ وہاں میرے پاس تھی ہی وہی۔ ورنہ کوئی سادی سی پہن لیتی۔ اُسے باندھ کر تو مجھے شرم سی آرہی تھی۔ اتنی چمک تھی۔ اس میں پھر رات کا وقت تھا۔ باہر نکلی تو سب بہنیں تیار کھڑی تھیں۔

''روبی! تلک لگا لو کہیں نظر نہ لگ جائے۔'' ثریا نے کہا۔

''نہیں لگتی نظر۔'' فرخندہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

''مگر آپی کب کسی کی سُنتی تھیں۔ مرچیں میرے سر سے لگا کر چولھے میں پھینک آئیں۔

فرخندہ کے رویے پر میرا دل اُداس سا ہوگیا۔ میں نے اسکارف سر پر باندھ لیا۔ اور سب کے ساتھ صحن میں آگئی۔ سامنے سے باقی سب بھی آگئے۔

رانی ماں نے مجھے دیکھتے ہی ''ماشاء اللہ چشم بددور'' کہا۔

بڑی اماں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے آپی سے کچھ کہا بھی۔ جسے میں نہ سن سکی۔ مگر آپی کا جواب میرے کان میں پڑ گیا۔ ''ماں جی! وہ کب مان رہی تھی۔ یہ تو ہمارے اصرار پر پہنی ہے۔''

''بچیوں کو وہی لباس پہننا چاہئے جو ان کے لیے مناسب ہو۔'' انھوں نے کسی قدر اونچی آواز میں کہا۔

''ذرا دیکھئے تو روبی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ اللہ سلامت رکھے۔ صبح ضرور صدقہ

دوں گی۔'' رانی ماں نے بڑی ماں سے کہا۔ اور ان کے تیور اور بھی کڑے ہو گئے۔

جی چاہا رہا تھا ساڑھی کو آگ لگا دوں۔ پہلے ایک دفعہ یہی ساڑھی میں نے ناز کی سالگرہ پر باندھی تھی تو سب کہہ رہے تھے۔ ''روبی! تم ساڑھی باندھا کرو۔ شلوار قمیض میں تمھارے جسم کی خوبصورتی چھپ جاتی ہے۔ اور ناز جب مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی تو اس نے اپنی انگلی آہستہ سے میرے رخسار سے لگا دی۔

''یہ کیا ہے نازی؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں سیاہی ہے کہیں نظر نہ لگ جائے خدا کے لیے روبی! سبز رنگ اور خصوصاً یہ شیڈ نہ پہنا کرو۔ آدھے دیکھنے والے کو سکتہ ہو گیا ہے۔''

اور یہ وہی ساڑھی تھی وہی میں۔ کتنا فرق پیدا ہو گیا تھا کچھ تو میں بچپن سے تھی ہی حساس کچھ وہاں کے ماحول نے اس قوتِ احساس میں شدت پیدا کر دی تھی۔ معمولی سے بات کا اثر بھی میری صحت پر ہوتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں کی باتیں میرے دل و دماغ پر مسلّط رہتی تھیں۔

''روبی!'' آپی نے مجھے آواز دی۔

''جی!'' میں چونکی۔

''چلو نا سب گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔''

نواب صاحب اور سلیمان ماموں کاروں کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔ نواب صاحب مجھے اس لباس میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سلیمان ماموں اتنی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ میرا دل گھبرا سا گیا۔ ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر پھیلی ہوئی تھیں اور رنگ بہت سرخ ہو رہا تھا۔

کچھ دیر میں نواب صاحب سے باتیں کرتی رہی۔ مگر سلیمان ماموں کی نظروں سے بچنے کے لیے میں جلدی سے پرے چلی گئی۔

''روبی! اِدھر آ جاؤ منصور بھیا کی کار میں۔'' آپی نے سب سے آخر والی کار میں سے آواز دی۔

''میں رُکی۔ کیونکہ سامنے والی کار بجائے سیدھا جانے کے ستون سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''کیا ہوا؟'' نواب صاحب گھبرا سے گئے۔

میں نے جھانکنے کی کوشش کی کہ کار ڈرائیو کون کر رہا تھا۔ مگر بیسود کیونکہ ڈرائیو کرنے والا باہر آ چکا تھا۔ وہ اختر تھے۔

''کچھ نہیں ابا حضور! زیادہ روشنی کی وجہ سے آنکھیں چوندھیا گئی تھیں۔''

''روشنی کہاں ہے یہاں تو پورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ رہی۔''

''ابا حضور! وہ نامعلوم مجھے کیوں ایسا لگا جیسے سورج کی ساری روشنی میری آنکھوں میں آ گئی ہو۔'' اختر کی نظریں مجھ پر تھیں۔

''خدا کا شکر ہے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ یہ تم گاڑی کیوں آگے کر رہے تھے؟''

''پیچھے سے منصور ہارن دے رہا تھا کہ مجھے نکل لینے دو میری کار میں سب بیٹھ گئے ہیں۔''

''پھر بھی احتیاط لازم ہے۔ ہاں روبی بیٹا! تم اختر کی کار میں بیٹھو۔ میں بیگم کو بھی بھیجتا ہوں۔''

''نہیں ابا حضور! میں منصور بھیا کی کار میں بیٹھوں گی۔'' اختر کا چہرہ اُتر گیا۔ ''وہاں آپی مجھے بلا رہی ہیں۔'' مجھے ڈر تھا کہ کہیں ان کی کار میں بیٹھ گئی تو وہ واقعی کار کو ٹکرا دیں گے۔ میں جا کر آپی کے پاس بیٹھ گئی۔ اور منصور بھیا نے کار اسٹارٹ کر دی۔

وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا۔ اختر کے چہرے کی بشاشت غائب ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ کسی حد تک چڑے ہوئے بھی تھے۔ مجھے اس کی وجہ کا پتہ تھا۔ مگر یہ بھی کوئی بات تھی بھلا۔ پھر ان کی کار میں بیٹھتے ہوئے مجھے شرم بھی آتی تھی۔ اختر ہر بات کو اتنی سنجیدگی سے لیتے تھے۔ پھر ان کا چہرہ ان کے دلی احساسات کا ایسا شفاف آئینہ تھا جس میں ان کا دکھ ہمیشہ جھلک پڑتا تھا۔ لیکن میرا اس میں کیا قصور تھا۔ اِدھر آپی بلا رہی تھیں۔ اور — پھر — اللہ — اختر بھی تو بغیر سوچے سمجھے خفا ہو جاتے ہیں۔

رات دس بجے کے قریب واپسی ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ اختر پہلے ہی ارشد۔ نسیم اور ظفر بھائی کو لے جا چکے ہیں۔ ان کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ میں چپ چاپ منصور بھیا کی کار میں بیٹھ گئی۔ آگے سلیم بھیا بھی بیٹھے تھے۔ آتی مرتبہ وہ اختر کے ساتھ تھے۔

''آپی! منصور بھیا کے ساتھ کون بیٹھا ہے؟'' میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے آپی کے کان میں کہا۔

''مجھے نہیں پتہ۔''

''پوچھ لو ان سے کون ہیں آپ۔''

''پوچھ لو۔''

''ذرا سنئے۔'' میں نے صرف آپی کو چڑانے کے لیے اونچی آواز میں کہا۔ مگر منصور بھیا نے میری آواز سُن لی۔

''کیا ہے روبی؟''

''جی!'' میری جان نکل گئی۔ ''آپی پوچھ رہی تھیں (آپی نے مجھے مُکّہ دکھایا) آپی کہہ رہی تھیں کہ گھر کتنی دور رہ گیا ہے؟''

منصور بھیا صرف مسکرا دیئے۔

''روبی! آپ جھوٹ بھی بول لیتی ہیں۔'' انھوں نے آپی کا مُکّہ سامنے لگے ہوئے شیشے میں دیکھ لیا تھا۔

''جھوٹ مصلحت آمیز شریعت میں جائز ہے منصور!'' مجھ سے پہلے سلیم بھیا بول اُٹھے۔

گھر ابھی دو میل دور تھا کہ کار بگڑ گئی۔ فرحت اور آپی تیزی سے آگے نکل گئیں۔ سلیم بھیا کار کے پاس ہی ٹھہر گئے۔ میں اور منصور بھیا بھی تیزی سے گھر کی طرف قدم اٹھانے لگے۔

''منصور بھیا! اب واپس گھر کب چلنا ہے؟''

''میرا خیال ہے سب پرسوں چلے چلیں۔''

''بھیا! ایک بات اور کہنی تھی آپ سے۔

''کہیے۔''

''شادی کی مبارک باد دینی تھی۔''

''اوہ— روبی! کاش یہ شادی ہوتی۔ کاش میں آپ کو دکھا سکتا کہ اس شادی کے لیے میرے دل میں کتنی خوشی ہے۔''

''بھیا! اپنے لیے تو ہر کوئی جیتا ہے مگر زندگی اسی کی ہے جو دوسروں کے لیے جئے۔ اپنی خوشیوں اور خواہشات کا احترام تو ہر کسی کے دل میں ہوتا ہے۔ مگر ایسے بہت کم ہیں جو دوسروں کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے روبی! مگر کاش اسے صرف پتہ چل جاتا۔ جس کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔''

''کیا آپ کا اشارہ اختر بھائی کی طرف ہے؟''

''نہیں۔ اس کی طرف جو مجھے کائنات کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ مگر جسے میں عزیز نہیں ہوں۔''

''منصور بھیا! کیا اس دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جسے آپ عزیز نہ ہوں۔''

''جس حد تک اور جس طرح وہ مجھے عزیز ہے اس حد تک میں اسے عزیز نہیں ہوں۔''

''کیا آپ مجھے اس کا نام نہ بتائیں گے۔''

''وقت آنے پر بتاؤں گا اور صرف آپ کو بتاؤں گا۔''

''وہ وقت کب آئے گا؟''

''ابھی بہت دیر ہے اس کے آنے میں۔''

''مگر بھیا! میں تو اڑھائی سال اور ہوں آپ کے پاس۔''

''کون جانے یہ قلیل عرصہ کیا کیا انقلاب لائے۔''

میں منصور بھیا کی بات نہ سمجھ سکی۔ اس لیے خاموش رہی۔ گھر پہنچتے ہی منصور بھیا مجھے اندر پہنچا کر دوسری کار میں سلیم بھیا کو لینے چلے گئے۔

رات گئے تک مجھے نیند نہ آئی۔ اختر کی اداسی میرے دل میں تیر کی طرح اُتر چکی تھی۔ اختر اور مجھ میں یہی فرق تھا۔ ان کا چہرہ ہلکے سے ہلکا غم بھی ظاہر کر دیتا تھا۔ مگر میرے چہرے سے بڑے بڑے صدمے کی غمازی بھی نہ ہوتی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں بڑی اماں منصور بھیا سے ناراض ہو رہی تھیں کہ لڑکیوں کے ساتھ سلیم بھیا کو کیوں لایا۔ وہ سمجھا رہے تھے کہ سلیم کو مجبوراً بیٹھنا پڑا تھا۔ پھر کار بگڑنے پر وہ کار کے پاس ہی تو رہا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ تھوڑا آ گیا تھا۔ بڑی ماں کو دراصل میرے لباس کا غصّہ تھا۔ اور وہ اسے کسی نہ کسی طرح نکالنا چاہ رہی تھیں۔ اور میرا یہ خیال سو فیصد صحیح ثابت ہوا۔ جب انھوں نے آپی اور منصور بھیا سے اس ساڑھی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔

آپی کی آواز بہت کم مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ مگر بڑی ماں کی ہر بات مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں تا کہ نہ ہی کچھ سن سکوں اور نہ اس کا اثر لے سکوں۔ آنسو میری آنکھ میں مچل رہے تھے اور میں نے انھیں بہنے دیا۔ تا کہ کچھ تو دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ کاش غموں کی اسی روانی کو میں بہتا سمندر سمجھ سکتی۔ مگر پھر بھی اس سمندر کی لہریں مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتیں۔ جی چاہتا تھا پاپا آ جائیں اور ان کے سینے پر سر رکھ کر اتنا روؤں کہ اور رونے کی سکت باقی نہ رہے۔ پاپا تو تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان کی نازوں پلی بیٹی کے لباس تک پر اعتراض ہوتے ہیں۔ اچھا ہی تھا جو وہ یہ سمجھتے تھے کہ مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں۔ ورنہ میرے رنج کا خیالی تصور بھی انھیں بیقرار کرنے کے لیے کافی تھا۔

میں نے آہستہ سے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔

''اے خالقِ کائنات! تُو میرے دلی احساسات سے واقف ہے۔ مجھے اتنی طاقت دے کہ موجودہ حالات کا مقابلہ کر سکوں۔ چاہے اس مقابلے میں مجھے ہرا ہی دے۔ مگر مجھے ان لوگوں کی خدمت اور عزت کرنے کی توفیق دے۔ تا کہ پاپا کی گردن میں یہ سن کر جھک نہ جائے کہ ان کی بیٹی اپنے بزرگوں اور محسنوں کی عزت کرنا نہ جانتی تھی۔

میرے مولا! پاپا کی زندگی کے غم بھی مجھے دے دے۔ مگر ان کی راہِ حیات کو پھولوں سے سجا دے میری چاہے زندگی ختم ہوجائے مگر ان کا بال بیکا نہ ہو۔ میری وجہ سے انھیں کوئی دکھ نہ پہنچے۔ میرے نام سے سدا ان کا سر اونچا رہے۔

میرے مولا میری شرم و حیا کی لاج رکھ لے۔ اے مالک! اختر کی غلط فہمیوں کو دور کردے۔ تو میرے دل کو جانتا ہے۔ مجھے نیک بننے کی توفیق دے۔ آمین!''

نامعلوم کیوں دعا مانگ کر میرے دل کو ہمیشہ تسکین سی ہوجاتی ہے۔ اس بلند اور مقدس ہستی سے مدد لے کر دل کو سکون ملنا غیر معمولی نہ تھا۔

صبح ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میری آنکھ کھل گیء۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں بستر سے اُٹھ کر وضو کرنے چلی گئی۔ اور دیر تک کھڑکی میں بیٹھی وظیفہ کرتی رہی۔

اس رات کے عجیب سے خواب نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ خواب کچھ ایسا بھیانک بھی نہ تھا۔ مگر اس کا اثر بڑا گہرا تھا۔ میں نے دیکھا۔ جیسے میں اور اختر خوشبو سے مہکتے پھولوں سے باغ میں سے گزر رہے ہیں کہ اچانک پاپا آگئے۔ میں نے انتہائی خوشی سے اختر کو ان سے ملایا۔ مگر ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے رہے۔ ''روبی! کاش میں تمھیں اس نوجوان کو دے سکتا تو مجھے کتنا سکون اور تسلی ہوجاتی۔'' مجھے اچھی طرح یاد تھا انھوں نے یہ کہا تھا اور پھر اختر سے مخاطب ہوگئے۔ ''اختر بیٹا! شاید میں تمھیں کبھی مل سکوں۔ اس وقت تم اس بڑے انعام کی توقع رکھنا۔ ورنہ......''

اور اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ آخر پاپا نے یہ سب کیوں کہا۔ میرے دل کو سخت بے چینی لگی تھی۔

صبح کا اُجالا پھیلنے تک میں وظیفہ کرتی رہی۔ جس سے مجھے کافی سکون ملا۔

''روبی پاری! تم کچھ پریشان ہو کیا بات ہے؟'' آپی میرے پاس آئیں۔

''کچھ نہیں آپی! رات ایک خواب سے ڈر گئی۔''

''پگلی ہو جو خواب کا اتنا اثر لیتی ہو۔ تمھارا رنگ حیرت انگیز حد تک پیلا ہو رہا ہے۔''

میں نے چپ چاپ سر ان کے کندھے سے لگا دیا اور دیر تک روتی رہی۔

''روبی! میری جان کیا ہوا ہے تمھیں۔ خواب ہی تو تھا نا۔ بس ختم کردو اور ہنس دو۔''

اسی طرح وہ مجھے دیر تک دلاسے دیتی رہیں۔ نو بجے کے قریب سب ثریا کے ماموں کے ہاں چلے گئے۔ آپی مجھے دانستہ چھوڑ گئیں تاکہ سکون سے سو سکوں۔

ان کے جانے کے بعد میں باہر باغ میں جا بیٹھی۔ بڑے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ کوٹ میرے کندھے پر پڑا تھا۔ مگر پہننے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ایک درخت سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور آنکھیں بند کرلیں اِکّا دُکّا بوندیں پڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے خوشگوار موسم میں اندر مقید ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ کچھ اس خواب نے۔ کچھ بڑی ماں کی باتوں نے اور کچھ اختر کی ناراضگی نے مجھے نڈھال سا کردیا تھا۔

''روبی!''

میں نے آنکھیں کول دیں۔ سامنے اختر کھڑے تھے۔ میں درخت کے سہارے پر کھڑی ہوگئی۔

''کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی ہاں شکریہ!''

''پھر کیا ہوا ہے؟''

میں نے بتایا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''ایک خواب کا اتنا اثر۔ اور خواب میں کیا دیکھا ہے؟''

''یہ صرف خواب کا اثر نہیں ہے۔ اس میں آپ کی بلاوجہ ناراضگی کا دکھ بھی شامل ہے۔''

''میری ناراضگی سے آپ کو کیا دکھ پہنچ سکتا ہے۔'' وہ کسی قدر طنز سے بولے۔

''دکھ صرف وہی نہیں ہوتا جس کی غمازی چہرہ کرسکے۔ ایک تو پہلے ہی میری طبیعت پریشان تھی۔ دوسرے آپ نے منہ پھلا لیا۔''

''روبی! کل میں نے ایک پری دیکھی۔ جس کے چہرے کا نور شباب پر تھا۔

اچانک وہ میرے سامنے بجلی کی طرح آ کر کوندی اور میری کار کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ مگر وہ بڑی سنگدل تھی۔ اس نے میری کار میں بیٹھنے سے انکار کردیا اور اس طرح مجھے اس خوشی سے محروم کردیا جو اس کے دیکھنے سے مجھے ہوتی ہے۔''

''کل میں نے بھی ایک سنگدل اور وہمی شہزادہ دیکھا۔ جو کسی کی مجبوریوں اور مصلحتوں کو سمجھے بغیر ہی ناراض ہوجاتا تھا جسے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کے معمولی سے رنج پر مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ اسی طرح معمولی باتوں کا برا مان کر مجھے دکھ دیتا ہے۔ کاش اُسے کوئی یہ بتا دے کہ......'' آنسو میری آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

''روبی! کیا واقعی تمھیں میرے رویے سے دکھ پہنچا ہے؟''

''کیا رنج کا اظہار صرف منہ پھلانے سے ہوسکتا ہے؟''

''روبی! مجھے یوں لگا تھا جیسے اس پری نے منصور کو مجھ پر ترجیح دی ہو۔''

''اس دنیا میں اس کے لیے کوئی ایسا نہیں جسے وہ آپ پر ترجیح دے سکے۔''

''روبی! تم کتنی نیک معصوم سی روح ہو۔''

میں چپ رہی۔

وہ رکے۔ ''تمہاری تصویر لے لوں۔ مگر کل والے کپڑوں میں۔''

''نہیں کل والے کپڑوں میں نہیں۔ وہ ساڑھی بڑی منحوس ہے۔ جس کے باندھنے پر آپ روٹھ گئے۔ اور اس روز مجھے خواہ مخواہ رونا آرہا تھا۔''

اختر پریشان ہوگئے۔ ''روبی! مجھے معاف کردو۔ میری خاطر مسکرا دو۔ چلو سونے کا جھومر لے دیں گے۔ ہنس پڑو۔'' انھوں نے جان بوجھ کر جھومر کا نام لیا تھا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

''مجھے اب اندر جانا چاہیے۔''

''روبی! ایک لمحہ اور رُک جاؤ۔''

''اس لمحے میں آپ کیا کریں گے؟''

''میں وقت کی نبضیں تھام لوں گا۔ زندگی کو روک لوں گا۔ اور اللہ سے کہوں گا

اس لمحے کے اختتام کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' میں نے منہ بنایا۔

''بڑی خراب باتیں کرتے ہیں آپ۔'' انھوں نے میری نقل اُتاری۔ ''یہی کہنا تھا آپ نے؟''

''مجھے نہیں پتہ۔'' میں جھوٹ موٹ روٹھ کر اندر آ گئی۔

اختر لاج میں ہماری وہ آخری بات تھی۔ صبح کی گاڑی سے ہم سب سوائے بڑی اماں اور نواب صاحب کے واپس جا رہے تھے۔ رانی ماں وہیں اپنے کسی عزیز کے ہاں ٹھہر رہی تھیں۔ سورج کی کرنیں اپنی تمازت کھو چکی تھیں دور اُفق میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں کے سائے پھیلنے کے بعد غائب ہو رہے تھے۔ کچھ عجب سا اُداس ماحول تھا۔ کئی سرمئی شامیں کتنی اُداس اور نوحہ کناں ہوتی ہیں۔ کتنی بوجھل افسردہ جو کاٹے نہیں کٹتیں۔ پہاڑوں کا سا بوجھ اور آسمانوں کی سی بے رحمی لیے ایسی شامیں نہ جانے کیوں آتی ہیں۔ اور اگر آتی ہیں۔ تو ہماری خوشیاں کیوں لوٹ لیتی ہیں۔ ہمیں اپنی اُداسی سے اُداس کیوں کر جاتی ہیں۔ کتنی غیر مانوس فضا تھی۔ سُست سُست وقت۔ تھمی تھمی زندگی۔ گھٹا گھٹا ماحول۔ در و دیوار پر خاموشی چھا رہی تھی۔ پچھلے دنوں کا شور۔ قہقہے اور مسکراہٹیں دور فضاؤں میں گم ہو رہے تھے۔ ان کا اثر گونج کی طرح باقی تھا۔

رات کے کھانے تک میں باہر گراؤنڈ میں بیٹھی رہی۔ پھر مجبوراً اندر جانا پڑا۔ کھانا بڑی بے دلی سے کھایا۔ سب بہن بھائی دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ مجھے بھی زبردستی بٹھا لیا گیا۔ منصور بھیا کی وجہ سے ثریا نہ تھیں۔

''روبی! اللہ کب تک باہر بیٹھنے کا ارادہ ہے؟''

''اب تو اندآ ہی گئی ہوں۔ ارادے کا کیا ہے؟

''یہاں اتنے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں بھلا باہر کیا رکھا ہے۔''

''فرخندہ! تم چپ رہو۔ بڑے لوگ باہر گراؤنڈوں میں ویرانوں کھنڈروں اور نہ جانے ایسی کتنی الٹی سیدھی جگہوں پر بیٹھ کر قدرت کی رنگینیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن

سُنو مگر کسی سے کہنا نہیں ایسا کرنا محض اپنی قابلیت کا ڈھونگ رچانا ہے۔ ہوتا ہواتا اس سے کچھ بھی نہیں۔'' محض آواز اور لہجے سے میں پہچان سکتی تھی کہ ارشد بھائی ہیں۔

''روبی تم سے زیادہ لائق ہے ارشد!''

''رضو! میں ایم۔اے ہوں۔''

''سیڑھیاں چڑھ کر ہی بلندیوں پر پہنچا جاتا ہے۔'' منصور بھائی نے کہا۔

''پھر چھ سال بعد روبی بھی تو ایم۔اے ہوجائے گی۔''

''رضو! کون جیتا ہے تیری—'' اُنہوں نے بات ادھوری چھوڑی۔

''تم سے جیتنے کو کون کہتا ہے۔'' آپی نے چڑ کر کہا۔

''ہم تو اسی دن مر گئے تھے جب—'' وہ پھر بات پوری نہ کر سکے۔

''بڑے بے غیرت ہو مر کر بھی زندہ ہو۔'' نسیم بھائی بولے۔

''روبی! خدا کی قسم اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ارشد کے چھکّے چھڑا دیتی۔ آخر یہ سمجھتا ہے کیا اپنے آپ کو۔ جب دیکھو تنگ کر رہا ہے جب دیکھو باتیں بنا رہے ہیں جناب۔'' آپی کچھ تلخی سے بولیں۔

''مگر آپی! میں نے تو ان باتوں کو سوائے کسی قدر تلخ مذاق کے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ دوسرے میں کسی سے اُلجھنا نہیں چاہتی کچھ دنوں کے لیے آپ کے پاس ہوں۔ انھیں بھی لڑ جھگڑ کر گذار دوں تو کیا یاد کریں گی آپ میرا۔''

''دیکھا فرخندہ! تو نے شاعرانہ رنگ؟'' ارشد بھائی پر کسی بات کا خاک اثر نہ ہوتا تھا۔'' تین سال کے عرصے کو کچھ دنوں سے تشبیہ دی جارہی ہے۔''

''ارشد'' منصور بھیا آپے سے باہر ہوگئے۔'' بکواس بند کرو۔''

میں نے پہلی مرتبہ منصور بھیا کو اس حالت میں دیکھا۔ غصے سے ان کا رنگ خون کی طرح سرخ ہورہا تھا۔ اختر غصے سے دانت پیس رہے تھے۔ ان کی زور سے بھینچی ہوئی مٹھیوں کو دیکھ کر میرا دل کانپ سا گیا۔ میں نے اپنے رنج کو دل ہی دل میں دفن کر دیا۔ اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ میرا دل تو اسی دن غم میں ڈوب گیا تھا۔ جس دن

پاپا یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب تو ان دکھوں کی عادت سی ہوگئی تھی۔ پھر غم کا مرکز تو دل ہے چہرہ تو اس رنج کا اظہار کرسکتا ہے۔ جو کبھی کبھی ہوتا ہے۔ پھر اپنے احساسات کو ظاہر کر کے میں ارشد بھائی کے سامنے اپنا سر نیچا کرنا نہ چاہتی تھی۔ چاہے جان چلی جائے آن نہ جائے۔ میں نے ماں سے جینا سیکھا ہے۔ دل تو پہلے ہی غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ مزید ٹھوکروں سے سوائے اس کے کہ ان گہرایوں میں بھی تلاطم پیدا ہوتا رہے اور کیا ہوسکتا۔ پھر یہ تلاطم۔ یہ اُبھرتے ہوئے دکھ۔ ڈوبتے ہوئے احساسات۔ بڑھتی ہوئی تکلیفیں۔ دامن بچاتے ہوئے حوصلے۔ کٹتے ہوئے الفاظ۔ مجبور زبان۔ اُنڈلتے ہوئے خیالات۔ تھپکیاں دیتا ہوا پاپا کی عزت کا احساس۔ یہی تو متاعِ زندگی تھا۔ اسے لٹتے کیسے دیکھ لوں۔ اسے درہم برہم کر کے جیئوں کس کے سہارے؟ اور میں مرنا نہ چاہتی تھی۔ کچھ دیر کی مہلت۔ پاپا کو دیکھے بغیر میرا سانس کبھی بھی نکل سکے گا۔ چاہے یہ تکلیفیں میرے دامنِ دل کو تار تار کردیں۔ چاہے میری زندگی کھوکھلی ہوجائے۔ مگر صرف پاپا کو دیکھنے تک میں زندہ رہنا چاہتی تھی۔ چاہے ایک طرف سے پاپا داخل ہوں اور دوسری طرف میری روح اس دکھوں کے گہوارے سے نکل جائے۔ صرف پاپا کو ایک نظر دیکھ لوں۔ صرف ایک نظر۔

''ارشد! میری قسم روبی سے معافی مانگ لو۔'' آپی کی بھرائی ہوئی آواز مجھے خیالات سے حقیقی دنیا میں لے آئی۔

''ارشد! اگر آج تم نے روبی سے معافی نہ مانگی تو میں زندگی بھر تم سے بات نہ کروں گا۔'' منصور بھیا کا غصّہ معراج پر تھا۔

''منصور بھیا! آپ خواہ مخواہ ناراض ہورہے ہیں۔''

اختر کے کھلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر میں جلدی سے بول اٹھی نہ چاہتی تھی کہ وہ کچھ کہیں۔ ''غلطی تو میری ہے جو بھول گئی کہ تین سال کے طویل عرصے کو کچھ دن کہنا حماقت ہے۔''

''مگر روبی——!'' آپی رودیں۔

''آپی! آپ کیوں اتنا اثر لے رہی ہیں۔ ایسی معمولی باتوں کو تو لٹے ہوئے سانس کی طرح بھول جانا پڑتا ہے۔''

''لیکن آج ارشد کو معافی مانگنی پڑے گی۔'' منصور بھیا آپے میں نہ تھے۔

''نہیں بھیا! میری غلطی تھی۔ اگر ارشد بھیا کو آپ نے مجبور تو کیا میں — میں —'' اور وہ صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹنے لگا جو میں نے پوری قوت سے تھاما ہوا تھا۔'' منصور بھیّا! آپ میری خاطر اس بات کو بھول جایئے اور اب کبھی بھی اس کا ذکر نہ کیجئے۔'' میں نے دوبارہ جلدی سے کہا تا کہ اختر اس بات میں قطعاً حصّہ نہ لے سکیں۔

''بھیّا! آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوسکتے۔ کبھی نہیں۔'' ارشد بھائی نے اتنے وثوق اور پیار سے کہا کہ منصور بھیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''ارشد! میرے پیار اور اپنے مان سے نہ کھیلو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

بڑی ماں کے آنے سے بات کا رُخ بدل گیا۔ اور میں نے شکر کیا۔ وہ کچھ گھر کے متعلق ہدایات دے رہی تھیں۔ میں چپ چاپ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ آپی وغیرہ نزدیک ہی کسی کو ملنے چلی گئیں۔ ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ سوئی سوئی چاندنی پتوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ نامعلوم کیوں ایک شعر بار بار لبوں پر آ رہا تھا۔

تفکراتِ زمانہ یہ حادثات والم مجھے قبول مگر زندگی نہ تھک جائے

درختوں کے سائے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ صرف پتوں کی سرسراہٹ اور میرے دل کی دھڑکن اس سکوت کو توڑ رہی تھی پھول پتے اور درخت سرگوشیوں میں مجھے کہہ رہے تھے۔ تم پھر دُکھوں کا بوجھ لیے ہمارے پاس آ گئی ہو۔ اور یہ تھا بھی صحیح کبھی بھی کوئی بات ہوتی تھی تو میں کسی انسان کے پاس نہ بیٹھتی تھی۔ ان کی کھوکھلی ہمدردیاں میرے لیے ہمیشہ مزید پریشانی کا باعث ہوتی تھیں اور پتوں اور پھولوں کی بے لوث محبت سدا تسکین دیتی تھی۔

''روبی!'' اختر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''جی''

''سوچا جانے سے پہلے تمھیں مل آؤں۔''

وہ اس حد تک اُداس تھے کہ مجھے بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ میرے اس قدر قریب کھڑے تھے کہ ان کے سینے کی دھڑکنیں مجھے صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

''روبی! پاپا کب آ رہے ہیں؟ کیا وہ جلدی نہیں آ سکتے۔''

''دو سال تک آ جائیں گے۔ مگر آپ کو ان کے آنے کی کیا جلدی ہے؟''

''روبی! میں تمھیں — میں تمھیں جلد سے جلد اپنے پاس لے آنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تم اس گھر میں رہو جہاں کی ہر بات کا تمھارے دل پر اثر ہو۔ آج ارشد کی بات پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ مگر تم نے مجھے بولنے کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ آپ کا ان سے اُلجھنا مجھے پسند نہیں۔''

''مگر روبی —!''

''بھول جایئے اس بات کو میری خاطر۔''

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

''روبی! سُنو میرے گھر کا ذرّہ ذرّہ تمھیں الوداع کہہ رہا ہے صرف اس امید پر کہ تم پھر یہاں آ ؤ گی ہمیشہ کے لیے۔'' وہ جذباتی ہو رہے تھے۔ ''روبی! تمھیں یہاں سے جانے کا افسوس نہیں؟''

''نہیں۔ بلکہ خوشی ہے اگر یہاں اور رہی تو آپ یقیناً پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگیں گے۔ بھلا کھانے پر آپ مسلسل مجھے کیوں دیکھ رہے تھے؟''

''روبی! جب تم سامنے ہوتی ہو تو مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔''

''اسی لیے تو خوشی ہے کہ جا رہی ہوں ورنہ میرے یہاں رہنے سے آپ کو روز ہی بھوکا رہنا پڑے گا۔''

''میں بھوک سے مر بھی جاؤں تو کوئی بات نہیں۔ مگر تم سامنے رہو۔''

''پھر ویسی باتیں شروع کر دیں آپ نے۔''

''بڑی خراب باتیں۔'' وہ اداسی سے مسکرائے۔

''اتنی بیزاری سے کیوں مسکرا رہے ہیں آپ؟''

''روبی! ایسی حالت میں کیا مسکراؤں جبکہ دل ڈوب رہا ہو۔''

''بھلا کوئی بات بھی ہو یا خواہ مخواہ ہی دل ڈوب رہا ہے۔''

''روبی! تم مجھے مسکرا کر دکھاؤ۔''

میں نے محض انھیں تسلی دینے کے لیے مسکرانا چاہا۔ مگر آنسو نکل پڑے۔

''روبی—'' وہ بڑے کرب سے بولے۔ ''اتنا سا حوصلہ ہے تمھارا۔''

''اتنا بڑا حوصلہ تو تھا مگر آپ نے رُلا دیا۔

''روبی!'' وہ کچھ دیر بعد بولے۔ ''تمھیں پہلی مرتبہ دیکھا تو یوں لگا جیسے مدتوں تمھیں دیکھا ہے۔ تمہاری آواز اتنی مانوس سی لگی۔ گویا برسوں سنتا رہا ہوں۔ تمھارے سانسوں کی تھکن۔ پاؤں کی آواز۔ کپڑوں کی سرسراہٹ۔ سبھی کچھ مجھ سے دور ہورہا ہے۔ میرا دل کوئی چھین رہا ہے۔ میری روح کی خوشیاں مجھ سے جدا ہورہی ہیں۔ روبی! میرے سامنے کوئی چاند کو آکاش سے دور لے جائے اور میں چپ رہوں۔ تمھیں یوں روک لینا تو میرے بس میں نہیں۔ مگر میرے تصورات کی وادیاں ہمیشہ تمھارے خیال سے مسکراتی رہیں گی۔'' ان کی نظریں اچانک میرے چہرے پر آ گئیں۔ ''روبی! یہ آنسو؟''

''آپ ہی تو ایسی باتیں کرتے ہیں۔''

''نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ مجھے یہ سب کہنا نہ چاہئے تھا۔ نامعلوم کس تاثیر کے تحت کیا کیا بک گیا۔ تم نے برا تو نہیں مانا؟''

''آپ راج گڑھ کب آئیں گے؟'' میں نے بات بدل دی۔

''بہت جلد۔ کوئی بہانہ ملنے کی دیر ہے فوراً پہنچ جاؤں گا۔''

''بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو آپ کی پھوپی ماں کا گھر ہے۔''

''میں پہلے بھی وہاں بغیر کسی وجہ کے نہیں گیا۔ اب اگر گیا تو خواہ مخواہ سب حیران ہوں گے۔ اور بہانوں کا کیا ہے کہہ دوں گا نصیبِ دشمنان منصور علیل ہیں۔''

''بڑے خراب ہیں آپ؟''

''سچ مچ۔'' وہ معصومیت سے مسکرا دیئے۔

''روبی!'' وہ ہچکچائے۔ ''تمھیں وہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟''

''تکلیف۔ ہرگز نہیں مجھے وہاں اپنے گھر سے زیادہ آرام ملتا ہے۔''

''پھر بھی مجھے یوں لگتا ہے تم — تم خوش نہیں ہو۔''

''وہمی ہیں آپ بھی۔ میں تو بے حد خوش ہوں۔''

''پھر بھی روبی! اگر کبھی بھی خدانخواستہ کوئی تکلیف ہو تو مجھے فوراً لکھ دینا۔''

مجھے نزدیک ہی سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا کوئی تیزی سے اندر جارہا تھا۔ برآمدے کی تیز روشنی میں مجھے دور سے اس کا سیاہ کوٹ نظر آیا۔

''اب مجھے جانا چاہیئے۔''

اور فضا ایک دم خاموش سی ہوگئی۔ سرسراتی ہوائیں رُک گئیں۔ پتوں کی سرگوشیاں بند ہوگئیں۔ یوں لگا جیسے سب کچھ ہمہ تن گوش ہے۔ مگر وہاں سُننے کو تھا ہی کیا۔ صرف دھڑکنیں۔

اختر بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑی گہری اُداسی تھی۔

''خدا حافظ!'' میں نے آہستہ سے مُڑتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ!'' اختر وہیں کھڑے رہے اور ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔

میں نے اُچٹتی سی نظر کمرے میں ڈالی۔ سیاہ کوٹ پہنے ارشد بھائی میز پر سر رکھے بیٹھے تھے۔

صبح کی گاڑی سے ہم راج گڑھ لوٹ آئے۔

راج گڑھ کی ایک ہی چیز مجھے بے حد پسند آئی تھی اور وہ تھا وہاں کا موسم۔ گرمیوں میں بھی وہاں پر اتنی سردی پڑتی کہ سوئٹر پہننا پڑتا۔ اور سردیوں میں تو انتہا ہی ہوجاتی۔ اسکول سردیوں میں دو مہینے کے لیے بند ہوجاتے۔ میری بھی تھوڑی چھٹیاں باقی تھیں اس لیے خدا کا نام لے کر امتحان کی تیاری شروع کردی۔ پاپا کے دو خط آئے رکھے

تھے۔ میں نے انھیں ناز کی منگنی جانے کا لکھا تھا۔ اُنہوں نے نواب صاحب کو آئندہ خط میں لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

اسکول کھلتے ہی امتحان شروع ہوگیا۔ خدا خدا کرکے امتحان ختم ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے سر سے بوجھ اُتر گیا ہے آخری پرچہ دے کر آتے ہی میں سوگئی اور شام تک سوتی رہی۔ مغرب کے قریب آکر آپی نے جگایا۔

''روبی! پچھلے ایک مہینے سے تم سے جی بھر کر باتیں کرنے کی حسرت ہے۔ اب تو امتحان ختم ہوچکا ہے۔ آؤ باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''میں ان کے ساتھ باہر آ گئی جہاں باقی سب بیٹھے تھے۔

''روبی! امتحان ختم ہوگیا؟'' منصور بھیا نے پوچھا۔

''جی ہاں شکر ہے۔ مگر اب پتہ نہیں چلتا کہ کروں کیا۔''

''شاندار فرسٹ ڈویژن۔'' ظفر بھائی ہنسے۔

''جو اللہ کو منظور ہے۔''

''ظفر بھائی سفارش کرادیں۔ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو ہم پہ الزام آئے گا۔'' ارشد بھائی نہ رہ سکے۔

''آپ کی مہربانی کا شکریہ! میں نے سفارشوں سے پاس ہونا نہیں سیکھا۔''

''روبی! اب ان دو مہینوں میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''آرام سے سوؤں گی۔ ایک مہینے سے جی بھر کر سونے کو ترس گئی ہوں۔''

''روبی! تمھیں نیند سے بڑا پیار ہے۔''

''آپی! چھوٹی سی تھی تو نانی اماں ایک کہانی سُنایا کرتی تھیں ایک بوڑھے آدمی کی جو چھ مہینے سوتا تھا اور چھ مہینے جاگتا تھا۔ مجھے ہمیشہ اس کی چھ ماہ کی زندگی پر رشک آتا تھا۔ پچھلے سال امتحان کے بعد میں پورے چھتیس گھنٹے سوتی رہی۔ پاپا ہمیشہ کہا کرتے تھے روبی جاگتے میں بھی سونے کے خواب دیکھتی ہے۔''

بوا باہر سے خطوط لے کر آئی اور منصور بھیا کو دے دیئے۔ اُنہوں نے دو خط

میری طرف بڑھا دیئے اور باقی خطوط کھول کر پڑھنے لگے۔

پہلے میں نے پاپا کا خط کھولا۔ اتنا میٹھا خط تھا کہ تمام دن کوئی میٹھی چیز کھانے کو جی نہ چاہا۔ دوسرا خط میرے لیے اجنبی سا تھا۔ لفافہ پر لکھی ہوئی تحریر غیر مانوس تھی۔ جلدی سے کھولا۔ ناز کی امی کا تھا۔ پندرہ دن بعد ناز کی منگنی تھی۔ مجھے ابھی سے بلایا تھا۔

لکھا تھا۔ ''ناز کی منگنی پر ایسا کوئی بھی نظر نہیں آتا جسے پہلے سے بلالوں سوائے تمھارے۔ خط دیکھتے ہی چلی آنا۔ چھوٹی بہو میکے گئی ہوئی ہے۔ بڑی وقت پر آرہی ہے۔ تم آجاؤ تو کام میں بھی مدد ملے۔ تمھیں اشتیاق تو ہوگا ہی کہ آخر تمھارے دولھا بھائی ہیں کون؟ لڑکا ڈاکٹر ہے۔ بڑے اچھے خاندان سے ہے اس کا کوئی عزیز نہیں ہے سوائے ماموں کے جو ہمارے قریب ہی رہتے ہیں۔ انھوں نے ہی ساری بات شروع کی ہے میں نے تو ابھی خود لڑکے کو نہیں دیکھا۔ ارے ہاں وہ راج گڑھ میں ہی تو ڈاکٹر ہے۔ محمد اسلم۔ اُس کی ایک ہی بہن ہے گل لالہ۔ اسلم کے ماموں شادی جلدی کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ حج پر جارہے ہیں۔ اچھا ہے ناز تمھارے پاس راج گڑھ آجائے گی۔''

''کیا ہوا روبی! کس کا خط ہے؟''

''پاپا کا ہے۔ اور دوسرا ناز کی امی کا۔ مجھے منگنی پر بلایا ہے۔''

''کب ہے منگنی اور کس سے ہورہی ہے؟''

''بیس کو۔ ڈاکٹر اسلم کے ساتھ۔'' الفاظ بمشکل میرے حلق سے نکلے۔

''ارے اپنے ڈاکٹر کے ساتھ۔ بھئی واہ بڑی اچھی جگہ ہاتھ مارا ہے۔'' ظفر بھائی ہنسے۔

''ممتاز چچا نے ابا حضور کو بھی لکھ دیا ہے کہ روبی کو جانے سے نہ روکیں۔ یہ دیکھئے انھوں نے اسی خط میں لکھا ہے۔'' منصور بھیا نے خط مجھے دکھایا۔

''بھیا! اور کوئی خط نہیں آیا؟'' آپی نے پوچھا۔

''اختر آرہے ہیں نامعلوم انھیں کس مسخرے نے لکھ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ ارشد! یہ تمھارا کام تو نہیں؟''

''نہیں بھیا! میں ایسی بات کیوں لکھتا۔'' ارشد بھائی بیاہ سے واپس آنے کے بعد کافی سنجیدہ ہوگئے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے چہرے پر سنجیدگی سے زیادہ اُداسی تھی۔

مجھے ایک دم یاد آیا جب میں نے اختر سے راج گڑھ آنے کو کہا تھا۔ تو اُنہوں نے کہا تھا۔

''بہانہ ملتے ہی چلا آؤں گا۔ اور بہانے کا کیا ہے کہہ دوں گا سنا تھا نصیبِ دشمنان منصور علیل ہیں۔''

تصور میں اختر اسی طرح میرے سامنے کھڑے تھے۔ ''بڑی خراب باتیں کرتے ہیں آپ!'' الفاظ میرے ہونٹوں تک آ کر دب گئے۔

''بھیا! یہ تو آپ کے سُسرِ محترم کا خط ہے کیا فرماتے ہیں قبلہ؟'' نسیم بھائی نے خط کی طرف اشارہ کیا۔

''تم خود ہی پڑھ لو۔''

''اے لڑکو! کہاں کہاں سے خط آئے ہیں کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔'' بڑی ماں باہر سے آئیں۔

''سب سے پہلے تو سنئے اختر بھیا اسی ہفتے یعنی اترسوں تشریف لا رہے ہیں۔ دوسری خبر یہ ہے کہ سلیمان ماموں نے لکھا ہے کہ وہ دو مہینے کے اندر اندر ثریا آپا کی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔'' نسیم بھائی بڑی اماں کے پاس کھسکے۔

''دو مہینے میں۔ رضیہ جا ذرا نواب صاحب کو تو بلا لا۔'' آپی اٹھی ہی تھیں کہ نواب صاحب اور رانی ماں آ گئے۔

''کیسی کانفرنس ہو رہی ہے؟''

''اور سُنئے سلیمان نے لکھ دیا ہے کہ اگلے مہینے منصور کا بیاہ کر دیں۔''

''انشاء اللہ کر دوں گا بڑا اچھا خیال ہے۔ بہو گھر آ جائے گی رونق ہو جائے گی۔''

''خیال تو اچھا ہے مگر میرا ارادہ رضیہ اور منصور کا اکٹھا بیاہ کرنے کا ہے۔'' اور

آپی باہر چلی گئیں۔ ''رضیہ کے لیے کوئی لڑکا میری نظر میں نہیں ٹھہرتا۔''

میرا باہر جانے کا ارادہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ بات چھڑی دیکھ کر رُک گئی۔

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں کب تک رضیہ کو بٹھائے رکھوں گا۔ مگر کوئی لڑکا بھی نظر آئے۔''

''لڑکا اب گھر بیٹھے تو آپ کو ملنے سے رہا۔ نہ جانے کیسے چین آتا ہے آپ کو۔ جتنے لڑکے خاندان میں ہیں آپ—''

''بیگم! میں رضو کو زہر دے دوں گا۔ مگر خاندان میں نہ بیاہوں گا۔''

''ابا حضور! چھوٹا منہ بڑی بات میرا بولنا مناسب تو نہیں مگر میں رضو کا بڑا بھائی ہوں۔ اس لیے مجھے کہنے دیجئے کہ ایک لڑکا میری نظر میں ہے جو ہر لحاظ سے اس قابل ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ اچھے خاندان کا ہے۔ نیک ہے۔''

''کون ہے وہ بیٹا؟''

میرا دوست سلیم!!''

یوں لگا جیسے ایٹم بم کمرے میں آ گرا ہو۔ بڑی ماں نے تمام دہلی سر پر اٹھالی۔

''رضو کو زہر آپ کیوں دیں۔ میں دوں گی۔ بلکہ منصور اسے زندہ درگور کرے گا۔ سوچتی تھی منصور کو بہن سے بڑا پیار ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ بھائی کے روپ میں دشمن ہے سلیم کے پاس ہے کیا جو تو رضیہ کا نصیب ڈبونا چاہتا ہے۔ نازوں پلی بچی ایک فقیر کو دے دوں۔''

''بیگم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''بس آپ رہنے دیجئے میرے کلیجے میں آگ لگادی۔ منصور! میں کب سوچ سکتی تھی کہ تم ایسا کرو گے۔ کیا بگاڑا ہے رضیہ نے تمھارا۔ جو تم نے اس کے لیے سلیم کو چنا۔ جان چھڑکنے والی بہن کو ساری عمر کا رونا دینا چاہتے ہو۔ منصور! تم رضیہ کے بھائی نہیں دشمن ہو۔ تم سانپ بن کر بہن کو ڈسنا چاہتے ہو۔''

''امی!'' منصور بھیا نے بڑے کرب سے کہا۔ ''رک جایئے اور تاب نہیں

ہے۔‘‘

’’منصور! میں تمھیں مرتے دم تک معاف نہیں کروں گی۔‘‘

’’بیگم! ایسی کون سی بات ہوگئی ہے کہ قیامت ہی برپا کردی۔ منصور نے صرف بات ہی تو کی ہے کوئی رضو کو اٹھا کر اُسے دے تو نہیں دیا۔‘‘

بڑی ماں غصے سے باہر چلی گئیں۔

’’منصور بیٹا! ان باتوں کا اثر نہ لینا نہ جانے کیوں تمہاری ماں کو اتنا غصہ آ گیا۔‘‘

’’نہیں ابا حضور! اماں چاہے ہزار گالیاں بھی دے لیں میں اُف نہ کروں گا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں رضیہ کی شادی صرف سلیم سے ہوگی۔ ورنہ ہوگی نہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ نواب صاحب چونکے۔ ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

’’واقعی بھیا! آپ اگر ضد کریں گے تو انھیں زیادہ تکلیف ہوگی۔‘‘ ارشد بھائی نے کہا۔

’’ارشد! اگر اپنی زندگی دے کر بھی میں رضو کو سلیم سے بیاہ سکوں تو مجھے زندگی جانے کا غم نہ ہوگا۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ نواب صاحب کچھ سمجھ چکے تھے۔ ’’منصور! میرے ساتھ باہر چلو میں تمھیں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔‘‘

نواب صاحب کے ساتھ ہی رانی ماں بھی باہر چلی گئیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نجانے کیا ہوگا۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ فرحت تو باقاعدہ رو رہی تھی۔ بھائی اُداس اور پریشان تھے۔ مغلانی کھانے کے لیے کہنے آئی مگر کھانے کا کسے ہوش تھا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آپی میرے پلنگ پر لیٹی تھیں۔

’’آپی!‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔ اور وہ میرے گلے لگ جو روئی ہیں تو میرا حوصلہ بھی ٹوٹ گیا۔

’’آپی! بھلا آپ کیوں پریشان ہیں؟‘‘

’’روبی! میں مر کیوں نہ گئی۔ منصور بھیا میرے لیے ذلیل ہوئے۔ ابا حضور اور اماں کے لیے میں بوجھ بن گئی۔ اللہ میں مرگئی ہوتی تو اچھا ہوتا۔‘‘

’’آپی! جی چھوٹا نہ کیجئے۔ منصور بھیا اپنی بات پوری کرکے رہیں گے۔‘‘

’’نہیں روبی! نہیں، مجھے اپنی خوشیوں سے زیادہ اپنے گھر کی خوشیاں عزیز ہیں۔ ان سے کہہ دینا میرا ہاتھ اپنی خوشی سے کسی کے ہاتھ میں دے دیں میں اُف نہ کروں گی۔ روبی! ہمارا انجام یہی ہوتا ہے۔‘‘

دروازے پر دستک ہوئی۔

’’کون ہے؟‘‘

’’روبی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔‘‘ منصور بھیا تھے۔

’’ٹھہریئے میں باہر آتی ہوں۔‘‘

’’کیا بات ہوئی منصور بھیا؟‘‘

’’روبی! مجھے روشنی دکھایئے۔ اب راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ ہی نے رضو کی خوشیوں کی منزل دکھائی تھی آپ ہی راہ میں چراغ جلایئے۔ ان آندھیوں نے جلتے ہوئے چراغ بھی بجھا دیئے ہیں۔‘‘

’’ہمت نہ ہاریئے بھیا! خدا آپ کے ساتھ ہے بہنیں بوجھ اور باعثِ تکلیف بننے کو پیدا نہیں ہوتیں۔ ابا حضور سے کیا باتیں ہوئیں؟‘‘

’’روبی! گو میں اُن سے صاف بات نہیں کہہ سکا۔ مگر وہ سب سمجھ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ رضو کو یہاں سے صرف سلیم لے جائے گا۔ مگر ان کی طرح میں بھی اماں کی ناراضگی سے گھبرا گیا ہوں۔‘‘

’’گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ وہ ماں ہیں ماں کا دل اپنی اولاد کی بہتری کے لیے تڑپتا ہے۔ وہ سلیم بھیا کی خوبیوں سے واقف نہیں اسی لیے انھیں ڈر لگتا ہے کہ آپی ان کے ساتھ خوش نہ رہ سکیں گی۔‘‘

’’روبی! یہ بات نہیں ہم دولت کے پُجاری ہیں۔ سلیم کے پاس سب کچھ ہوتے

ہوئے بھی کچھ نہیں جبکہ اس کے پاس چاندی کے سکّے ہی نہیں۔''

''یہ بات نہیں بھیا! ماں باپ ہمیشہ بیٹیوں کے لیے ایسا گھرانہ تلاش کرتے ہیں جہاں کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ آپ نے بھی تو انھیں نہیں بتایا کہ سلیم بھیا برسرِ روزگار ہیں۔ اور ماشاء اللہ ایک ہزار تنخواہ لے رہے ہیں۔ پھر ان کا خرچ بھی کیا ہوگا اکیلے ہی تو ہیں۔''

یہ تو سب صحیح ہے مگر اب میں کیا کروں؟ مجھے کوئی راہ دکھایئے کوئی تجویز بتایئے۔''

میں نے انھیں تسلّی دی۔ ان کے جانے کے بعد آکر میں بھی لیٹ گئی۔ مگر رات گئے تک نیند نہ آئی۔

صبح ناشتہ بڑی خاموشی سے ہوا۔ گھر کی فضا مکدّر ہوچکی تھی۔ بڑی ماں اپنے کمرے میں ہی رہیں۔ چاروں طرف بڑی مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

دو دن اسی طرح گذر گئے۔ تیسرے دن اختر آرہے تھے۔ ان کی آمد کے ذکر کے ساتھ ہی منصور بھیا کی شادی کا ذکر چھڑ گیا۔ اور ہوتے ہوتے بات اسی نقطے پر جاپہنچی جس کا ڈر تھا۔

''منصور! ضد چھوڑ دو۔ مجھ سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کرو میں تمہاری ماں ہوں۔ اگر تم اپنی ہٹ سے باز نہ آئے تو میں قیامت تک تمہاری شکل نہ دیکھوں گی۔''

''اماں! اگر آپ نے بے جا مخالفت نہ چھوڑی تو میں خود ہی آپ کو اپنی شکل نہ دکھاؤں گا۔ میں یہ گھر چھوڑ دوں گا اور قیامت تک اِدھر کا رخ نہ کروں گا۔'' منصور بھیا نے اتنے عزم سے کہا کہ میرا دل لرز کر رہ گیا۔

بڑی ماں کا دل پسیجا۔ سب انھیں سمجھانے لگے۔ گھنٹہ بھر تو نواب صاحب سمجھاتے رہے۔

''اچھا منصور! تو جیتا اور میں ہاری۔'' آخر انھوں نے کہا۔

''میری امی!'' منصور بھائی نے ان کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ ''اس ضد کے لیے مجھے معاف کردیجئے جیت میری نہیں آپ کی ہے۔ مجھے معاف کردیجئے۔''

یہ ایسا سین تھا کہ نواب صاحب تک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی ماں نے منصور بھیا کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور ان کی پیشانی چُوم لی۔

''منصور بیٹا! مجھے بتا تو سہی سلیم کرتا کیا ہے رہتا کہاں ہے؟''

''منصور بھیا نے سب کچھ بتا دیا اور البم منگا کر سلیم بھیا کی تصویر انھیں دکھائی۔

''جیتا رہے۔ اللہ میری رضو کو بوڑھا سہاگن کرے۔'' انھوں نے تصویر کو سینے سے لگا کر دعا دی۔

اور میں سوچنے لگی ماں کا دل بھی کتنی اچھی چیز بنایا ہے اللہ نے۔

نواب صاحب باہر چلے گئے۔

''اماں! ہمارا منہ میٹھا کرائیے۔'' ارشد بھائی نے کہا۔

''کھانڈ کھالے۔'' ظفر بھائی بولے۔

''اماں! سلیم بھیا کو تار دے کر بلوالوں؟'' ارشد بھائی نے کہا۔

''اب آیا تو اپنی حرکتوں پر۔ اچھا بلا لے مگر دیکھ اپنے ماموں کو بھی تار دے دینا وہ بھی لڑکا دیکھ لیں۔''

سب بیٹھے تھے مگر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دراصل میں آپی کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے بے چین تھی۔ آپی ان دنوں زیادہ وقت میرے ہی کمرے میں گذارتی تھیں۔ کیونکہ وہ ذرا الگ تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوئی تو آپی نماز کے بعد دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہی تھیں۔ میں نے لپک کر ان کے ہاتھ تھام لیے اور انتہائی خوشی میں گانا شروع کیا۔

اب کس کی دعا مانگوں۔

مل گئے جب تم ہی اب اور میں کیا مانگوں۔

''کیا ہوا روبی؟''

''ہونا کیا تھا وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ اس مہینے منگنی اگلے مہینے بیاہ۔ اور اس ہفتے سلیم بھیا خود تشریف لا رہے ہیں۔''

آپی میرے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگیں۔

''اتنا بڑا معرکہ مارا ہے انعام تو دلوایئے۔''

''مجھے لے لو۔''

''نا بابا۔ آپ کے تو جملہ حقوق تک محفوظ ہو چکے ہیں۔ پھر سلیم بھیا تو میری جان کھا جائیں گے۔''

آپی کا چہرہ جو دو ہی دن میں اُتر گیا تھا۔ سورج کی روشنی کی طرح چمک رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے بھرپور تھا۔ ناچنے کو جی چاہتا تھا۔ دامن خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ڈالی ہر پتّہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ پھولوں اور کلیوں پر انوکھی مسکراہٹ تھی۔ خوشی کی لہر نے تمام گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اِس رات مارے خوشی کے مجھے دو دن تک نیند نہ آئی۔ یوں لگتا تھا اس خوشی کو ہضم نہ کرسکوں گی۔ کل شام اختر بھی آرہے تھے۔ ان کی آمد کے تصور سے ہی زندگی پلٹا کھاتے محسوس ہوتی تھی۔ نجانے کس دنیا میں اُڑ رہی تھی۔ آسماں کی بے پایاں وسعتیں بھی تنگ محسوس ہورہی تھیں۔ سارے جہاں کی خوشیوں سے میرا دامن مزیّن تھا۔ رنگ برنگے غباروں کی طرح دو مہینے کے بعد اختر آرہے تھے۔ نجانے کیسے ہوں گے۔ اور نجانے کب نیند نے اپنے نرم پروں میں مجھے لپیٹ لیا۔

صبح آسمان گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ گو بارش نہ ہورہی تھی مگر موسم بڑا ہی خوشگوار ہورہا تھا۔ ایسے میں میرا جی ہمیشہ گانے کو چاہتا ہے اگر بہت اچھے موڈ میں ہوں۔ اگر عام حالت میں ہوں تو عموماً کوئی ناول لے کر لیٹ جایا کرتی ہوں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دھڑکنیں بھی تیز ہوتی جارہی تھیں۔

سلیم بھیا کو جوابی تار دیا جاچکا تھا۔ بس خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ نو بجے کے قریب میں اندر والی گراؤنڈ میں جا کر بیٹھ گئی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میمونہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''باجی! بوجھئے ہمارے پاس کیا ہے؟''

''لڈّو۔''

''اوں ہوں۔''

''گڑیا۔''

''اوں ہوں۔ ہار گئیں۔''

''ہوں۔''

''یہ تو آپ کا خط ہے۔''

لفافے پر ناز کی مخصوص تحریر تھی۔ میں نے جلدی سے خط کھولا۔

''روبی پیاری!

امی کا خط تمھیں ملا ہی ہوگا اور نجانے تم کتنی خوش ہو رہی ہوگی۔ تم کیا جانو مجھ پر کیا بیت گئی۔ سب جگہ اطلاع جا چکی تھی۔ سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ مگر روبی! سنا تم نے انھوں نے انکار کر دیا ہے!!

ان کے ماموں رات آئے تھے بری طرح رو رہے تھے۔ وہ خود ایک دو دن میں راج گڑھ آرہے ہیں۔

روبی! یہ سب کیا ہوگیا۔ کتنی بدنامی ہوگی۔ امی کا رو رو کر بُرا حال ہے۔ ایک آس بندھی ہے شاید مان جائیں روبی! سوچتی ہوں میں پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مرگئی۔ تم تصوّر بھی نہ کرسکو گی یہاں کیا حالت ہے یوں لگتا ہے کسی کی موت ہوگئی ہے۔ غلطی اپنی ہی ہے۔ یہ نہ پوچھا کہ لڑکی بھی راضی ہے یا نہیں۔

''روبی! میرے دکھ کا اندازہ نہ کرسکو گی۔ لڑکیاں ایسی ہی قسمت لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ غصّہ آیا کرتا تھا کہ آخر راجپوت اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی کیوں مار دیتے ہیں۔ اچھا ہی کرتے تھے وہ روبی!

لڑکیاں ماں باپ کا سر جھکا دیتی ہیں۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار ہوتی ہیں۔ روبی! مجھے یہ دکھ جینے نہ دے گا۔ اللہ! مجھ سے بڑھ کر بدنصیب کون ہوگا۔ جس کی وجہ سے سارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ امی کی حالت کا تصور بھی تمھیں

کپکپا دے گا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتیں کہ منگنی نہ ہونے کی وجہ سے سب کو کیا بتائیں گی روبی! اگر میں مرجاؤں تو کتنی آسانی پیدا ہوجائے۔ پھر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ لڑکی ہی مرگئی۔''

خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ ایک لمحے کے لیے تمام دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ اسلم کے انکار کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ آخر— کہیں ایسا تو نہیں۔ دماغ چکرا سا گیا۔ میں ہر قیمت پر ڈاکٹر سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر کیسے ملوں۔ ان سے ملنا ناممکن تھا۔ انھیں دنوں ان کے ماموں وہاں آرہے تھے۔ میں ان کے آنے سے پہلے ڈاکٹر سے خود مل لینا چاہتی تھی ناز کی زندگی میری وجہ سے خطرے میں گھری ہوئی تھی۔

اللہ! میں کیا کروں۔ دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا خوشیاں بکھر گئیں۔ غبارے فضا میں کھو کر رہ گئے۔ دُور سے میمونہ بھاگی آرہی تھی۔ میں سب سے بچنا چاہتی تھی۔ اس وقت مجھے صرف ایک چیز کی ضرورت تھی۔ تنہائی۔

دوپہر کے کھانے کے لیے میں کمرے سے باہر نکلی۔ سلیم بھیا کی آمد کی اطلاع آچکی تھی۔ سب حیران تھے کہ ایکا ایکی مجھے کیا ہوا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ طبیعت خراب ہے۔ دماغ ماؤف ہوچکا تھا۔ کوئی صورت بھی تو نظر نہ آتی تھی ڈاکٹر اسلم سے ملنے کی۔

''میرے مولا! کسی طرح ڈاکٹر کو بھیج دے۔'' میں نے صدق دل سے دعا مانگی۔

شام کو صحن میں خاصا ہنگامہ تھا۔ میں اوپر چھت پر جابیٹھی۔ عجب کشمکش میں تھی۔

روشنی آہستہ آہستہ دور ہوتی جارہی تھی۔ دل مایوسیوں میں ڈوب رہا تھا۔ چھ بجے کے قریب باہر کار کی آواز آئی۔ اور چند لمحات بعد اختر کی مخصوص آواز صحن میں سنائی دی۔ نجانے کیوں آنکھوں میں آنسو آگئے۔ منصور بھیا نے نیچے سے مجھے آواز دی۔ میں خاموشی سے اٹھ کر دوری منزل پر چلی گئی۔ اختر کی آمد کی خوشی نجانے کہاں کھوگئی تھی۔ ایک گھنٹہ سوچتی رہی جب دماغ گھومنے لگا تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلی سیڑھی پر کھڑے ہو کر میں نے ایک بار پھر دعا کی۔

''میرے مولا! میری مدد کر۔''

نیچے میمونہ کھڑی تھی۔ جو مجھے ہاتھ کے اشارہ سے سمجھا رہی تھی کہ اختر آ گئے ہیں۔ دو منزل کی سیڑھیاں سیدھی ہونے کے باوجود بھی میمونہ کی آواز مجھ تک نہ پہنچ رہی تھی۔ دماغ پھٹ رہا تھا۔ اختر آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر کو کیسے ملوں — اختر — ڈاکٹر — ناز'' اسی گھبراہٹ میں پہلی سیڑھی سے پاؤں پھسلا اور —

اور جب آنکھ کھلی تو تمام جسم پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور اسلم میرے سامنے بیٹھے تھے۔

رات گئے تک ڈاکٹر اسلم بیٹھے رہے۔ میری دعا قبول تو ہوئی مگر ادھوری۔ سب کی موجودگی میں بھلا ڈاکٹر سے کیسے کچھ کہتی میں کہنا کیا چاہتی تھی۔ یہ مجھے خود بھی معلوم نہ تھا۔ میرے اچانک گر کر زخمی ہوجانے سے سبھی پریشان تھے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد سب میرے کمرے میں آ گئے۔ میری نظریں چاروں طرف گھومتی پھریں۔ مگر اختر وہاں نہ تھے۔ ان کے ساتھ منصور بھیا بھی موجود نہ تھے۔ میں نے خاموشی سے آنکھیں بند کرلیں۔

''روبی! میری جان کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟''

''آپی! بائیں ٹانگ اور بازو میں زیادہ تکلیف ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے جلد ہی ٹھیک ہوجاؤں گی۔''

''خدانخواستہ کہیں ہڈی پر چوٹ نہ آ گئی ہو۔ اللہ! ہمیں تمھارا ہی آسرا ہے۔ امانت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اپنا فضل و کرم شامل حال رکھیو۔'' بڑی ماں ایسے موقعوں پر ہمیشہ پریشان ہوجایا کرتی تھیں۔

''ماں جی! ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ کل ایمبولینس میں لٹا کر ہسپتال لے جائیں گے تاکہ ایکس رے لیا جاسکے۔''

''لیکن نسیم! کل تک انھیں حرکت دینا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔''

''ارشد! یہ معلوم کرنا تو ہر حال میں ضروری ہوگا کہ ہڈی کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔''

''بھئی ایسی خراب بات منہ سے نہ نکالیے۔ اللہ اپنا رحم فرمائے۔''

''میرے مولا! اگر میں نے کبھی بھی کوئی نیکی کی ہے۔ تو آج اس کے بدلے میں مجھے اپنی رحمت سے مالا مال کردے۔ میں تیری رحمت کی بھیک مانگتا ہوں۔ روبی کی ہڈی کو نقصان نہ پہنچا ہو۔''

''ابا حضور! پریشان نہ ہوجیۓ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اتنی معمولی چوٹ ہے مگر درد بھی تو زیادہ نہیں جو ہڈی کو ضرب پہنچنے کا احتمال ہو۔'' میں نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا۔

مگر نواب صاحب متفکر ہی رہے اور اسی فکر میں آہستہ آہستہ سب اُٹھ کر سونے چلے گئے۔

رات کچھ درد کی زیادتی نے سونے نہ دیا۔ اور کچھ۔ کچھ اختر کو نہ دیکھ سکنے کا رنج رہا۔ بوا ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سوئی۔ میں نے بہتیرا کہا کہ ٹھیک ہوں۔ مگر وہ اللہ کی بندی ساری رات میرے پلنگ سے لگی رہی۔ پچھلے پہر جب مجھے نیند آ گئی تو اس وقت تک نواب صاحب بڑی ماں اور رانی ماں مجھے دو دفعہ دیکھ کر جا چکے تھے۔

صبح کاذب کے وقت جاگنے پر بھی بوا کو جاگتے دیکھ کر میرا دل نجانے کیوں بھر آیا۔ ویسے تو وہ کل سے ہی رو رہی تھی مگر میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

بوا نماز کے لیے اٹھی۔ تو میرے پلنگ کو آہستہ سے جنبش ہوئی۔ اس ہلکی سی جنبش سے مجھے اتنی تکلیف ہوئی کہ بے اختیار منہ سے چیخ نکل گئی۔

''بوا! پلنگ مت ہلاؤ۔ میری جان نکل جائے گی۔''

دن نکلنے آنے پر سب سے پہلے جو کمرے میں داخل ہوا وہ منصور بھیا تھے۔

''کیسی طبیعت ہے روبی؟ درد کچھ تھما؟؟''

''شکریہ ٹھیک ہوں۔''

''میں رات ڈاکٹر کے جانے تک نہ بیٹھ سکا۔ سلیم کے آنے کی اطلاع آ چکی

تھی۔ میں اور اختر اُسے لینے چلے گئے ٹرین لیٹ تھی۔ اور گھر آنے پر بھی ہم دونوں باہر مہمان خانے میں سلیم کے پاس بیٹھے رہے۔'' منصور بھیا نے اتنے خلوص سے یہ سب کہا کہ میرا جی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''سلیم بھیا آ گئے؟'' اتنی تکلیف کے باوجود بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''آ گیا ہے۔ مگر روبی! اس کے اس طرح آنے کی آدھی خوشی تو آپ کے یوں اچانک بیمار پڑ جانے سے جاتی رہی۔''

''یہ بھی کوئی بات ہے بھیا! میں تو اب ٹھیک ہوں۔'' درد کی وجہ سے مجھ سے بولا بھی نہ جا رہا تھا۔

''روبی! آپ سب سے یہ کہہ سکتی ہیں اور ہر کوئی مان بھی لے گا۔ کہ آپ کو زیادہ تکلیف نہیں ہے۔ لیکن میں کیسے مان سکتا ہوں۔ آپ کے چہرے پر ابھرتی ہوئی خوبصورت درد کی مصنوعی مسکراہٹ بھی نہیں چھپا سکتی۔''

''بھیا! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں آپ سب کو اپنی طرف سے پریشان کرنا نہیں چاہتی۔''

نو بجے ڈاکٹر اسلم اپنے مخصوص انداز میں بیگ ہلاتے ہوئے اندر آئے۔

''ڈاکٹر! آپ کا کیا خیال ہے کیا ہڈی کو واقعی ضرب پہنچی ہے؟''

''نواب صاحب قبلہ! یہ بات تو ایس رے کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے۔''

''کیا ایکس رے آج کیا جائے گا؟''

''جی ہاں۔ میں اس معاملہ میں دیر کرنا نہیں چاہتا۔ باہر ایمبولینس کھڑی ہے۔ ایکس رے کے بعد ہی میں صحیح علاج کر سکوں گا۔''

''روبی کو وہاں کتنی دیر ٹھہرنا پڑے گا؟ آج مطلع بھی ابر آلود ہے کہیں بچی کو سردی نہ لگ جائے۔''

''آپ فکر نہ کیجئے مجھے ان کی بہت فکر ہے۔ دو تین گھنٹے تو ضرور ہسپتال میں لگ جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں میں جو ساتھ ہوں گا۔''

''نہیں ابا حضور! آپ تکلیف نہ کیجئے میں ساتھ چلا جاؤں گا۔''

''نہیں منصور! سلیم آیا ہوا ہے کل سے اس کے پاس کوئی بھی نہیں جاسکا۔ تمھارا گھر میں موجود رہنا ضروری ہے۔'' وہ بے چارہ بھی دل میں کیا سوچتا ہوگا۔''

جب مجھے اٹھا کر اسٹریچر پر لٹایا تو نواب صاحب پر تو اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ اندر سے سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں جس میں نمایاں آواز آپی کی تھی۔ بوا۔ نسیم بھائی اور ارشد بھائی میرے ساتھ ہسپتال گئے۔ ایکس رے کے وقت بھی تینوں بھائی میرے پاس کھڑے تھے۔

آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر اسلم ہاتھ میں ایکس رے کی رپورٹ لیے داخل ہوئے۔

''مبارک ہو۔ ہڈی کو کسی قسم کی چوٹ نہیں پہنچی۔'' فرطِ خوشی سے ان کا چہرہ سُرخ ہورہا تھا۔

''سچ ڈاکٹر؟'' راشد بھائی رپورٹ پر جھپٹے۔

''میں ذرا گھر فون کردوں وہاں سب فکر کررہے ہوں گے۔''

''آپ تکلیف نہ کیجئے۔ ابھی منصور صاحب کا فون آیا تھا میں نے خود ہی یہ خوشخبری ان تک پہنچادی ہے۔''

''مجھے گھر لے چلیے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ بھی تو آپ کا گھر ہے۔'' ڈاکٹر انتہائی نرمی سے بولے۔

''یہ تو ہسپتال ہے۔'' نسیم بھائی کے ہنسنے پر باقی سب بھی ہنس پڑے۔

''ڈاکٹر یار! یہ جملہ لوگ تو اپنے گھر کے متعلق کہا کرتے ہیں۔''

''اسی لیے تو کہا ہے میرا گھر تو یہی ہے۔''

''خیر یہ ہسپتال تو پھر غنیمت ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ کو پاگل خانے کا ڈاکٹر مقرر کیا جائے تو پھر یہ گھر والی بات تو—'' ارشد بھائی ظرافت پر اُتر آئے۔

ایک قہقہہ پڑا۔ اور ڈاکٹر شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

''آپ سب یہاں ٹھہریئے۔ مس ممتاز کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جائے گا۔''

''آپریشن تھیٹر میں کیوں؟''

''پلستر لگانے کے لیے۔''

نہ جانے کیوں دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ جیسے کوئی بڑی بات ہونے والی ہو۔ آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔ میں نے اسٹریچر پر پڑے پڑے تینوں بھائیوں کی طرف دیکھا۔

''گھبرایئے نہیں ہم سب آپریشن تھیٹر کے باہر موجود ہوں گے۔'' ارشد بھائی نے پہلی اور آخری مرتبہ مجھے مخاطب کیا۔

آپریشن تھیٹر کی تاریک فضا میں مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کسی بات پر نرس کو ڈانٹ رہے تھے۔ پلستر تیار ہو کر لگنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔

''بوا کیسی ہے اب ڈاکٹر؟''

بوا کچھ فکر سے اور کچھ رات بھر جاگنے سے ہسپتال پہنچتے ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔

''اب تو ہوش میں ہے آپ اپنا حال سنایئے۔''

''شکریہ! پہلے سے بہتر ہوں۔ یہ پلستر کتنے دنوں بعد اُترے گا؟''

''ڈیڑھ، مہینے بعد۔''

''اوہ!''

''گھبرایئے مت۔ آپ اندازہ بھی نہیں کرسکتیں آپ کے اس طرح زخمی ہونے کا مجھے کتنی فکر ہے۔ جلد سے جلد آرام دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ کیا آپ کو بہت رنج ہے اپنے زخمی ہونے کا؟''

''جی نہیں۔ اگر تھا بھی تو آپ سے ملنے کی خوشی میں جاتا رہا۔''

''سچ؟'' وہ نہ جانے کیا سمجھ کر مسکرائے۔

''ڈاکٹر! پہلے آپ ڈاکٹر تھے اور میں مریض۔ اب آپ بہنوئی ہیں اور میں بہن۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکے۔ ان کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔

''ڈاکٹر! ناز مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔''

''ہوں۔ اگر آپ کے اتنے گہرے تعلقات ہیں تو آپ جانتی ہوں گی میں نے وہاں شادی کرنے سے انکار کردیا ہے۔''

''جی؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا۔''

''ڈاکٹر! اگر آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کی تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ آپ دنیا کے سب سے زیادہ بدنصیب انسان ہیں۔''

''میری خوش بختی کی منزل میری نظروں کے سامنے ہے۔'' انھوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے یہ منزل کسی اور کی ہو۔ اور خود اس منزل نے کبھی آپ کو اپنا مسافر نہ سمجھا ہو۔ اسی موڑ پر آ کر آپ کا راستہ بدل گیا ہے۔''

''میں نے جس چیز کو چاہا ہے ہمیشہ حاصل کیا ہے۔''

''اگر آپ ناز کو دیکھ لیتے تو اُسے چاہے بغیر نہ رہ سکتے۔''

''ہوگا۔ مجھے اس کا زیادہ خیال نہیں۔''

''جو انسان کسی کی عزت کی پرواہ نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی عزت کو بھی عزیز نہیں رکھتا۔ اور جسے عزت کی پرواہ نہیں وہ کسی شے کو حقیقی معنوں میں چاہ نہیں سکتا۔''

''صبح ماموں بھی یہی کہہ رہے تھے۔ لیکن—''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ ڈاکٹر! وعدہ کیجئے آپ انکار نہ کریں گے۔''

وہ ہونٹ کھول کر رہ گئے۔

''میری خاطر۔''

''آپ کی خاطر تو ایک بیاہ تو کیا میں سو بیاہ کرسکتا ہوں۔ اطمینان رکھئے میں آپ کی خواہش رد نہیں کروں گا۔''

''شکریہ!'' اظہار تشکر میں میری آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگے۔

''لیکن یہ نہ بھولیے گا میں نے وعدہ صرف بیاہ کرنے کا کیا ہے۔''

''جی۔۔۔؟'' میں کچھ بھی سمجھ نہ سکی۔ پانچ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ ڈاکٹر کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ اپنا فیصلہ بدل نہ دیں۔

''اس وعدے کے عوض کچھ مانگ سکتا ہوں۔''

''جی!'' مجھ پر بیکسی سی طاری ہوگئی۔

''میرا مطلب ہے سودا ہوجائے ایک ہاتھ سے دیجئے اور دوسرے ہاتھ سے لیجئے۔'' وہ خالص بیوپاری لہجے میں بولے۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''مطلب تو صاف ہے اگر آپ چاہتی ہیں میں انکار نہ کروں تو آپ کو بھی ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔ ورنہ میرے انکار کی وجہ تو آپ جانتی ہیں اور اس کے اظہار میں آپ کی بھی نیک نامی نہ ہوگی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے کانپتی آواز میں کہا۔

''سوچ لیجئے میں بہت بڑی چیز مانگوں گا۔''

''ناز کی خوشی کی خاطر میں اپنی زندگی بھی دے سکتی ہوں۔'' میں نے صدق دل سے کہا۔

''اور جو میں زندگی سے بھی بڑی شے مانگوں؟''

''زندگی سے بڑی شے۔۔۔؟ کیا ہوسکتی ہے۔''

میں اندازہ بھی نہ کرسکی۔ میرا دل اس بُری طرح سے دھڑک رہا تھا کہ اس کے بند ہوجانے کا ڈر تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں ناز کی اُداس سی شکل میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اس کے خط کا ایک ایک لفظ مجھے سانپ بن کر ڈسنے لگا۔ قدرت میری وفاداری کا امتحان لے رہی تھی۔ ناز کا پیار پاؤں پڑ کر اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کے تحفظ کی بھیک مانگ رہا تھا۔

اچانک اپنے ہونٹوں پر مجھے لمس سا محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''اسے پی لیجئے دل کو تقویت ہوگی۔''

میں نے خاموشی سے ہونٹ کھول دیئے۔

''ڈاکٹر!'' مجھ سے بمشکل اتنا ہی کہا جاسکا۔

''باقی پھر کبھی سہی۔ اتنی کمزوری کی حالت میں مجھے آپ کے بے ہوش ہو جانے کا ڈر ہے۔''

''نہیں ڈاکٹر! یہ سودا ہو ہی جائے تو اچھا ہ۔ میں اپنا فرض ادا کر دینا چاہتی ہوں۔'' میری آواز ڈاکٹر کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ ''مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔'' میں نے حوصلے سے کہا۔

''شکریہ! میں بھی اپنا وعدہ پورا کروں گا۔''

''مگر—؟'' میں حیران تھی ڈاکٹر نے کچھ مانگا نہیں۔

''آج آپ کو ضرورت تھی آپ نے کچھ مانگ لیا۔ جب مجھے ضرورت ہوگی میں کچھ مانگ لوں گا۔ وعدہ تو آپ نے کر ہی لیا ہے۔''

''آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''یہ میں وقت آنے پر بتادوں گا۔ مگر پھر کہہ دیتا ہوں۔ وہ شے زندگی سے زیادہ قیمتی ہوگی۔ اور آپ اپنے وعدے سے پھر نہ سکیں گی۔''

''اگر زندہ رہی تو اپنا یہ قرض بھی ادا کردوں گی۔''

''شکریہ! اُمید ہے ہمارے تعلقات آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے۔''

''میں نے آپ سے ایک وعدہ کیا ہے دو نہیں۔''

''ہوں۔'' وہ رکے۔ ''اس دوا سے درد کچھ تھما؟''

''یہ دوا آپ نے درد کم ہونے کے لیے دی تھی یا زیادہ کرنے کے لیے؟''

''میں مطلب نہیں سمجھا۔'' حالانکہ وہ میرا اشادہ سمجھ چکے تھے۔

''باہر سے بھائیوں کو بلوا دیجیے۔'' ڈاکٹر کی موجودگی میں میرا خوف بڑھتا جا رہا

تھا۔ ’’مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔‘‘

’’کہئے تو طاقت کا انجکشن دے دوں؟‘‘

’’نہیں مجھے گھر بھجوا دیجئے۔‘‘

’’مگر آپ کو اس حالت میں گھر بھیجنا خطرے سے خالی نہیں۔‘‘

’’ڈاکٹر!‘‘ میں نے منت کی۔

اُنہوں نے گھنٹی بجائی۔

’’نواب صاحب کے صاحبزادوں کو بھیج دو۔‘‘

’’میری بچی!‘‘ بوا کو دیکھ کر میرا خوف اور بڑھ گیا جیسے—— جیسے میں نے کوئی قصور کیا ہو۔ اور اُسے ہر شخص سے چھپانا مقصود ہو۔

’’ڈاکٹر! کیا ہوا ہے انھیں۔ ان کی حالت پہلے سے بدتر کیوں ہے؟‘‘

’’میں خود پریشان ہوں۔ بظاہر ایسا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ مس ممتاز گھر جانا چاہتی ہیں۔ مگر میں ایسی حالت میں انھیں گھر والوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا نہیں چاہتا۔‘‘

’’ظفر بھیا! میں یہاں مر جاؤں گی مجھے گھر لے چلیے۔‘‘

’’ڈاکٹر! ہمیں ایمبولینس دیجئے۔‘‘

’’لیکن ان کے بے ہوش ہو جانے کا خطرہ ہے۔‘‘

’’اوہ—— ڈاکٹر! ہم آپ کو فون کر کے بلا بھی سکتے ہیں۔‘‘ ارشد بھائی چڑے۔

اور پانچ منٹ بعد میں ایمبولینس میں تھی۔

گھر میں ہر شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ میری نظریں ایک بار پھر مایوس ہو کر در و دیوار سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔ اختر وہاں موجود نہ تھے۔

’’روبی! میری جان تمھیں کیا ہو گیا ہے؟‘‘

’’آپی! مجھے اپنے دامن میں چھپا لیجئے۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔‘‘

’’الٰہی پرائی اولاد ہے عزت رکھنا۔‘‘ بڑی ماں بار بار یہی دعا دہرا رہی تھیں۔

’’ڈرنے کی کیا بات ہے ہم سب جو پاس بیٹھے ہیں۔‘‘ رانی ماں نے پیار سے

کہا۔

''رانی ماں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' آواز میرے ہونٹوں سے آگے نہ جاسکی۔

''روبی! آپ کا جسم کانپ رہا ہے کیا سردی لگ رہی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''منصور بھیا! میرا خیال ہے فون کر کے ڈاکٹر کو بلا لیا جائے۔''

''نہیں— نہیں۔'' میں نے پورے زور سے کہا۔ کسی نامعلوم شے کا خوف میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو منجمد کئے دیئے جا رہا تھا۔

ہر شخص پریشان تھا۔ میرا یہ خوف خود میرے لیے لانیحل مسئلہ تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ کوئی اپنے مضبوط بازوؤں میں مجھے یوں لپیٹ لے کہ یہ غم۔ یہ دکھ۔ یہ انجانا۔ اَن بوجھا خوف مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

''میری بٹیا! کیا بات ہوئی۔ دوڑنے والے گرا ہی کرتے ہیں۔''

''نہیں— ابا حضور! مجھے — مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر لگتا ہے۔ کس بات سے؟'' انھوں نے پیار سے پوچھا۔

''مجھے— ڈر لگتا ہے— مجھے ڈر لگتا ہے۔'' میری آواز اس حد تک سہمی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے گرد و پیش پُراسرار روحوں کی سانسوں کا گمان ہو رہا تھا۔

''منصور! کار میں جا کر ڈاکٹر کو لے آؤ۔'' رانی ماں نے کہا۔

''نہیں۔ ڈاکٹر کی بجائے حکیم شفاء الملک کو لے آؤ۔ ان سے کہنا مریض کو آپ تک نہیں لایا جاسکتا۔ اس لیے آپ کو تکلیف دی جا رہی ہے۔ فوراً جاؤ۔ کار پورچ میں کھڑی ہے۔''

حکیم صاحب کے آنے تک سب پیار کرتے رہے۔ مگر وہ نامعلوم سا خوف مجھ پر طاری رہا۔ کئی صدقے بھی دیئے مگر وہ ڈر نہ گیا۔ حکیم صاحب کی دوا سے دل کو تقویت سی پہنچی۔ کچھ میں نے ضبط سے کام لیا۔

دوپہر کے کھانے کے لیے بمشکل اصرار کر کے سب کو بھیجا۔ آپی پھر بھی میرے

پاس رہیں۔

''آپی! ایک بات پوچھوں؟''

''کہو۔''

''دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی شے کون سی ہے؟''

''زندگی۔''

''اس سے زیادہ قیمتی؟''

''پگلی! زندگی سے زیادہ کون سی چیز قیمتی ہو سکتی ہے؟''

''آپی! اگر کوئی یہ کہے کہ — کہ میں وقت آنے پر تم سے زندگی سے زیادہ عزیز شے مانگوں گا۔ تو اس کا — کیا مطلب ہوا؟''

''مطلب یہ ہوا کہ زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز ہو نہیں سکتی۔ اور وہ وقت آنے پر کچھ بھی نہ مانگ سکے گا۔''

''اوہ —'' میں نے لمبی سانس لی۔ جیسے ذرا سا اطمینان نصیب ہوا ہو۔

''مگر روبی! یہ بات تم کیوں پوچھتی ہو؟''

''یونہی ایک بُرے سے خواب میں میں نے دیکھا۔ جیسے مجھ سے کوئی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی شے کا مطالبہ کر رہا ہو۔ اسی سے میں ڈر گئی۔''

''روبی! میری زندگی سے قیمتی ایک چیز ہے۔''

''مجھے پتہ ہے؟''

''کیا بھلا؟''

''بھلا بتائیے ہمارے ہاں آج کون مہمان آیا ہے؟ وہی عزیز ہے نا آپ کو؟'' اتنی پریشانی میں بمشکل اپنے آپ کو مذاق پر آمادہ کر سکی۔

''وہ تم ہو۔'' انھوں نے اپنے ہونٹوں سے میری پیشانی کو چھوا۔

''جھوٹ موٹ نا؟''

''اوں ہوں۔ سچ مچ۔''

ان مذاق کی باتوں سے میرا خوف تو کم ہوگیا۔ مگر یہ بات جیسے دماغ میں جم کر رہ گئی— زندگی سے بڑھ کر کون سی شے ہوسکتی ہے؟

وقت گزرتے پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور وقت کے کبھی نہ رکنے والے چکر میں نہ جانے کیا کیا تبدیلیاں ظہور پذیر ہوجاتی ہیں۔ اور ان تین مہینوں میں کئی انقلاب آئے اور اپنا اثر چھوڑ کر چلتے بنے۔ ناز بیاہ کر راج گڑھ آ گئیں۔ آپی— گھر میں میرا ایک ہی ہمدرد— بیاہ ہوتے ہی سلیم بھیا کے ساتھ چلی گئیں۔ اگرچہ ثریا بھابی بن کر گھر میں آ گئیں۔ مگر آپی کی کمی کو کوئی پورا نہ کرسکا اسی دوران میں میرا پلستر بھی اتر گیا۔ ڈاکٹر اور ناز اکثر آتے رہتے۔ مگر ڈاکٹر کو میں نے کبھی خود مخاطب کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا رزلٹ آؤٹ ہونے والا تھا۔ اور اختر آئے ہوئے تھے۔ کچھ آپی کے چلے جانے سے۔ کچھ صحت کے گر جانے سے۔ اور کچھ دل کے یوں بیٹھ جانے سے کسی بات میں جی نہ لگتا تھا۔ یوں کھوگئی تھی جیسے راستہ بھول گئی ہوں۔ اُدھر اختر بضد تھے کہ مجھے کسی بات کا غم ہے۔ جو اتنی تیزی سے میری صحت گرتی جارہی ہے۔ میں بہتیرا یقین دلاتی۔ مگر میری صحت اور خاموشی انھیں اس حد تک پریشان کئے تھی کہ وہ ہر مہینے کسی نہ کسی بہانے راجگڑھ آجاتے۔

نواب صاحب پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوگئے۔ ان کی کمزوری کی وجہ سے منصور بھیا ریاست کے کاموں میں جٹ گئے۔ انھیں ملنا تو ایک طرف رہا دیکھنا بھی نصیب دنوں کے بعد ہوتا۔

میں برآمدے بیٹھی سوئٹر بن رہی تھی کہ منصور بھیا تیزی سے آئے۔

''روبی! رول نمبر کیا ہے؟''

''کیوں بھیا! کیا رزلٹ اخبار میں آ گیا؟''

''نہیں میں نے سوچا رول نمبر لکھ لوں شاید مجھے اس روز اتنی فرصت نہ ملے کہ پوچھنے آسکوں۔''

میں نے رول نمبر بتا دیا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ وہ اخبار لیے

دوڑتے ہوئے آئے۔

''مبارک ہو۔'' فرطِ خوشی سے وہ چیخے۔

''کیا ہوا بھیا؟''

''یہ رہا آپ کا رزلٹ۔''

میں نے جلدی سے اخبار لیا۔ میرے چھ سو اٹھارہ نمبر تھے۔

''مگر بھیا! آپ تو کہہ رہے تھے کہ آج رزلٹ نہیں آیا۔''

''وہ تو میں نے جان بوجھ کر کہا تھا تا کہ پہلے خود رزلٹ دیکھ کر اطمینان کرلوں۔''

اور اتنی دیر میں سب اکٹھے ہوگئے۔ اور میں مبارکبادیوں میں دب کر رہ گئی۔

غم و اندوہ کے ہجوم میں خوشی کی ہلکی سی کرن بھی دل کو کھلا دیتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔ بہت دنوں کے بعد خوشی کی خبر سنی تھی اس لیے بری طرح ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور دل پوری طاقت کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ ابا حضور انعام دینے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔ شام ہوتے ہوتے آپی کا مبارکباد کا تار آیا۔

سائے ڈھلنے تک اختر نہ لوٹے تھے۔ ان کے ساتھ ارشد اور نسیم بھائی بھی غائب تھے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے چوروں کی طرح تینوں اندر داخل ہوئے۔

''اختر! آج تمام دن کہاں غائب رہے؟'' منصور بھیا نے پوچھا۔

''منصور! یہ ارشد نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتا رہا؟''

''منصور بھیا! بھلا سوچیے میں لیے پھرتا رہا ہوں گا یا یہ مجھے گھماتے رہے ہوں گے۔''

''تمھارے بعد بہت بڑی خوشخبری ملی۔''

''کون سی خوش خبری؟''

انھوں نے میرے رزلٹ کا بتا دیا۔

اسی رات کوئی دس بجے کے قریب کسی نے میرے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کو کھٹکھٹایا۔ اگرچہ یہ بات غیر معمولی تھی۔ مگر میں نے ذرا ہمت سے کام لے کر کھڑکی کھول ہی دی۔

''آپ—؟''

''جی۔ مبارکباد دینے حاضر ہوا ہوں۔''

''آپ کو اس طرح یہاں دیکھ کر مجھے کتنا رنج ہوا ہے آپ اس بات کا اندازہ نہ کرسکیں گے۔ آپ کو اس وقت نہ آنا چاہئے تھا۔''

''مگر روبی! میرا مقصد تمھیں مبارکباد دینا تھا اور یہ بتانا کہ تمھارے رزلٹ پر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی ہے۔''

''اوہ— یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا ان رسمی الفاظ میں ظاہر ہوئے بغیر آپ کے احساسات مجھ سے چھپے رہتے— جایئے۔''

''روبی! میرا مقصد کچھ اور تھا مگر تم یونہی گھبرا گئیں۔ اچھا شب بخیر۔''

اختر جانے کے لیے مُڑے۔ اندھیرے میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آتے رہے۔ مگر یہ کیا—؟؟ اختر کے اندر داخل ہوجانے کے بعد ایک اور سایہ ان کے پیچھے نمودار ہوا۔ اور پھر چند لمحات وہاں رک کر برآمدے کی تاریکی میں روپوش ہوگیا۔ یہ کون ہوسکتا ہے؟— کون ہوسکتا ہے؟— آخر؟ اوہ نجانے صبح کیا آفت آئے کسی نے گھر میں سے اختر کو میرے کمرے کی طرف آتے دیکھا تھا!!

حسب معمول صبح ہوئی۔ اور سب کام معمول کے مطابق ہوتے رہے۔ تین دن گذر گئے ان دنوں میں کوئی قابل ذکر بات نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ ارشد بھائی کو نمونیہ ہوگیا۔ اور باوجود انتہائی کوشش کے انھوں نے دوا پینے یا کسی قسم کا علاج کرانے سے انکار کردیا۔ ان کی ضد اور حرکتوں سے پاگل پن ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے تو ان کے کمرے کے نزدیک سے گذرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ یہ اس صبح کا ذکر ہے جب اختر کو رخصت کرکے نواب صاحب اندر آئے ہیں۔ انھوں نے آتے ہی میرے متعلق پوچھا۔ بوا مجھے کمرے میں بلانے آئی۔

''بیٹا! یاد ہے تمھارے پاس ہونے پر میں نے انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ارشد کی بیماری اور مجنونانہ حرکتوں نے اتنا پریشان کیا کہ سب کچھ بھلانا پڑا۔''

''ابا حضور! آپ کی دعائیں میرے لیے سب سے بڑا انعام ہیں۔''

''روبی! آج میں تمھیں وہ چیز دوں گا جو دنیا میں تمھیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جس کی تمھیں توقع ہی نہ ہوگی۔''

''کون سی چیز؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو نہ صرف میری بلکہ سب کی نظریں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔

''روبی! تیار ہو؟''

''جی!''

''ممتاز تمھیں لینے آرہے ہیں!!!''

''جی—!!!'' میرے دماغ نے ہر بات قبول کرنے سے انکار کردیا— پاپا آرہے ہیں مجھے لینے— سچ مچ— پاپا آرہے ہیں۔

''روبی!'' رانی ماں نے میرا کاندھا ہلایا۔ ''لو یہ پانی پیو۔''

''رانی ماں! آپ نے سنا پاپا آرہے ہیں— مجھے لینے۔'' میں خود نہ جانتی تھی کہ اس خوشی کا متحمل میرا دل ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ گھر میں سب ہی خوش تھے اور فکر مند بھی کیونکہ ارشد بھیا کی حالت زیادہ ہی خراب ہوتی جارہی تھی۔

شام کے قریب ڈاکٹر کے لوٹ جانے پر میں ثریا بھابی اور منصور بھیا کے ساتھ انھیں دیکھنے گئی۔ بظاہر ان کا دماغ صحیح معلوم ہوتا تھا۔ مگر جو کچھ ان سے کہا جاتا تھا وہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔

''ارشد! تم نے کچھ سنا۔'' منصور بھیا نے انتہائی پیار سے پوچھا۔ مگر انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔

''ارشد! ایک خوش خبری سنائیں۔ پندرہ دن بعد ممتاز چچا آرہے ہیں۔''

''وہ کون ہے؟'' انھوں نے عجیب انداز میں پوچھا۔

''ارے وہ تو روبی کے پاپا ہیں۔''

''اچھا۔'' انھوں نے یوں تعجب کا اظہار کیا جیسے یہ انوکھی بات ہے۔

''وہ روبی کو لینے آ رہے ہیں۔''

''روبی کو۔'' انھوں نے ہونٹوں میں دوہرایا۔

''روبی کو تو جانتے ہو نا؟ یہ جو کھڑی ہیں۔''

''یہ تو میری زندگی ہے۔'' وہ یوں بولے جیسے منصور بھیا کی بات کی تصحیح کر رہے ہوں۔

''ارشد!'' منصور بھیا زور سے بولے۔ ''روبی! آپ برا نہ مانئے گا ارشد ہوش میں نہیں۔''

باقی سب کے اندر داخل ہونے پر میں ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ اور یونہی اس کے دراز کھولتی اور بند کرتی رہی۔ اوپر والے دراز میں سامنے ہی ایک کاپی سی کھلی پڑی تھی۔ وہ ارشد بھیا کی ڈائری تھی—!! نہ چاہتے ہوئے میں نے اُسے اٹھا لیا درمیان میں ایک جگہ اپنا نام دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ اس کے بعد کے ہر صفحے پر میرا نام تھا۔ نامعلوم کس جذبے کے تحت وہ ڈائری میں نے اپنی شال کے اندر کرلی۔ اور جلدی سے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈائری وہاں سے پڑھنی شروع کی جہاں سے میرا ذکر شروع ہوتا تھا۔

''۱۹ر جنوری

آخر وہ دن آ ہی گیا جب ممتاز چچا کی بچی ہمارے ہاں پہنچ رہی تھیں۔ ابا حضور نے مجھ سے اسٹیشن جانے کو کہا۔ مگر میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کردیا۔ بھلا مجھے بچوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ منصور بھیا گئے مگر خالی کار واپس آئے۔''

''ابھی ابھی ابا حضور نے ان سے ہمارا تعارف کرایا۔ روبی—! وہ بچی تو نہیں لڑکی ہیں۔''

''۲۰ر جنوری

مجھے یقیناً کچھ ہوگیا ہے روبی کا تصور شب و روز میرے حواس پر مسلّط رہتا

ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو میں یقیناً پاگل ہوجاؤں گا۔ میں انھیں جتنا چڑاتا ہوں وہ بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں...... رات کو اپنے کمرے میں آتا ہوں تو بھی جی نہیں لگتا۔ ڈائری تب باقاعدہ نہیں لکھ رہا۔ آج ہی بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے انھوں نے مجھے ہرادیا۔ مگر دوبارہ بڑی ماں کی موجودگی میں انھیں ہرانا میرے لیے آسان ہوگیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں۔ یہ ہار کس کی ہے ان کی یا میری؟''

''۳۰رجنوری

صبح ناشتے پر روبی سیاہ چشمہ لگا کر آئیں۔ میں نے حسب معمول اس بات پر بھی طنز کیا۔ لیکن سوچتا ہوں میرے چڑانے سے کہیں وہ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدانخواستہ مجھے ان سے دشمنی ہے۔ دشمنی اور ان سے۔ کوئی اپنی زندگی سے بھی دشمنی کرسکتا ہے۔''

''۱۰رفروری

پچھلے دنوں روبی بیمار پڑ گئیں۔ میں نے اپنے دن بھر کے معمول اور شرارتوں میں فرق نہیں آنے دیا۔ مگر راتوں کو کیا کروں— ان میں تو سوائے ان کی صحت کی دعا کے کچھ نہیں کرتا رہا۔ ڈائری میں کیا لکھتا...... آج وہ ٹھیک ہوگئی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ سمجھتی ہیں مجھے ان سے بیر ہے۔ اس روز میں نے ان کے سیاہ چشمہ لگانے پر چوٹ کی تھی۔ اور جب ڈاکٹر نے انھیں چشمہ لگانے کو کہا۔ تو ایک لمحہ کے لیے— صرف ایک لمحہ کے لیے ان کی نظریں میری طرف اُٹھیں۔ ایسے چند لمحوں کے لیے جن میں وہ اپنے آپ کو فتح مند محسوس کرتی ہیں۔ میں اپنی تمام زندگی دے سکتا ہوں۔''

۱۲رفروری

روبی کو چڑانا میرا معمول ہوگیا ہے۔ میں انھیں کیوں چڑاتا ہوں؟ خود بھی نہیں جانتا۔''

''۱۴رفروری

بوا شہر بیاہ پر دینے کے لیے سامان بنوانے گئی ہے۔ میرے ہاتھ خوب موقع آیا۔ بڑی ماں کو بھڑکا کر لطف اندوز ہورہا ہوں۔ مگر کہیں انھیں دکھ ہی نہ پہنچتا ہو۔ میں یہ

سب اس لیے کرتا ہوں کہ وہ شاید اسی بہانے مجھ سے مخاطب ہوں گی۔ مگر ایسی قسمت کہاں۔"

۱۵رفروری

بوا آ گئی ہے لیکن میں انھیں مسلسل تنگ کرتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی دل ڈرتا ہے کہیں وہ مجھ سے متنفر ہی نہ ہو جائیں مگر نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میرا جذبۂ دل خلوص کی ان بنیادوں پر استوار ہے جو یقیناً انھیں مجھ تک کھینچ لائے گا کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ جذبۂ دل کی تاثیر اُلٹی ہوجائے۔ نجانے کس جذبے کے تحت ایک گلاب کا سُرخ پھول میں نے ان کے پلنگ پر رکھ دیا۔ اور ساتھ ایک شعر ۔

ان چمکتے ہوئے خوابوں ہی سے دامن بھرلوں
سعئ بے سود سہی، تیری تمنا کرلوں"

"۱۶رفروری

آج شفو آپا کی شادی پر جارہے ہیں۔ رات سے طبیعت پژمردہ ہے۔ روبی نے سب کو سوئٹر بن کر دیئے ہیں۔ مگر میرا بوا نے بُنا۔ نجانے مجھ پر اس بات کا اتنا اثر کیوں ہے۔ صبح کار چلانے کے مسئلہ پر روبی نے براہِ راست مجھ سے پوچھا کیا زندگی بہت عزیز ہے آپ کو؟— وہ کیا جانیں ان کے ہاتھوں مرنا تو زندگی ہے۔"

"۲۰رفروری

روبی نظر آجاتی نہیں کبھی کبھی۔ وہی غنیمت ہے۔ آپا شفو عافیت سے رخصت ہوگئیں"

"۲۱رفروری

روبی سب میں بیٹھی تھیں کہ چیخ کر بے ہوش ہوگئیں— میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے صبح سے طبیعت پژمُردہ تھی۔ وہ اتنی حساس ہیں کہ ہر بات کا اثر ان کی صحت پر ہوتا ہے۔ میرے چڑانے سے بڑی اماں اور فرخندہ بھی ان کے خلاف

ہوگئیں ہیں۔ اللہ کرے ان کی بیماری مجھے لگ جائے۔''

۲۳/فروری

آج میں بچ گیا۔ سخت جان ہوں نا۔ ورنہ انھیں— اس نور کے مجسّمے کو سبز ساڑھی میں دیکھ کر زندہ بچ رہنا معجزہ ہی تو ہے۔ روبی میری زندگی پر یوں چھا گئی ہے کہ اُسے جدا کرنا دھڑکنوں سے دل کو جدا کرنا ہوگا۔''

''۲۸/فروری

آج کی رات بڑی اُداس اور منحوس ہے۔ میری شرارتیں خود بخود ماند پڑ گئی ہیں۔ آج چاند بھی نہیں نکلا۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ راہِ فرار نکال کر ڈائری لکھنے بیٹھا ہوں۔ اُف معبود! تم نے مجھے کیا دکھا دیا۔ اتفاقاً باغ ک طرف گذر ہوا۔ اور وہاں میں نے روبی کو اختر کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ اختر میرا ماموں زاد بھائی ہے۔ مگر اب دشمن ہے مجھے اُس سے نفرت ہے۔ مگر نہیں شاید وہ یونہی ان کے پاس کھڑا ہو۔ لیکن— میرا انجام قریب آ رہا ہے۔ میں یقیناً پاگل ہوجاؤں گا۔ آج صبح میں نے انتہائی ذلیل حرکت سے انھیں پریشان کیا۔''

''۳۰/فروری

شکر ہے ہم واپس راجگڑھ آ گئے۔ روبی اختر سے دور آ گئیں۔ مگر نجانے مجھے کیا ہوتا جارہا ہے۔ میری زندہ دلی کو کیا ہوا۔ میں زندگی سے ہار کر مرنا نہیں چاہتا۔

''۱۷/مارچ

روبی کبھی کبھی دُور ہوجاتی ہیں کہیں ان کے دل میں اختر کا خیال تو نہیں آتا۔ میرے مولا—!''

''۳۱/مارچ

زندگی کتنی تلخ ہوکر رہ گئی ہے۔ اتنا خدا کو چاہتا تو پالیتا۔ روبی کا امتحان ہورہا ہے۔ خدا کامیابی دے۔''

''۳/اپریل

اختر آ رہا ہے۔ لکھتا ہے سُنا ہے نصیبِ دشمنان منصور علیل ہیں۔ جانتا ہوں — سب سمجھتا ہوں۔"

"۷/اپریل

بڑی بےلطفی رہی لیکن شکر ہے انجام اچھا ہوا۔ بڑی ماں آپی کے بیاہ کے لیے مان گئیں۔"

"۱۰/جون

آج مدّت بعد لکھنے بیٹھا ہوں۔ یاد آیا سات اپریل کو روبی کوٹھے پر سے گری تھیں۔ آج ان کا پلستر اُترا ہے تو مجھے اتنا سکون نصیب ہوا کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ دے سکوں۔"

"۱۷/جون

آپی کا بیاہ ہوگیا (میں اسے ہمیشہ رضو کہتا ہوں مگر روبی کو آپی کہنا پسند ہے)۔ منصور بھیا کا بھی بیاہ ہوگیا۔ ان ہنگاموں میں بھی مجھے دکھ گھیرے رہے۔"

"۲۱/جون

اختر پھر آئے ہوئے ہیں۔ انجام اور بھی قریب ہے۔ مگر میں تیار ہوں۔"

"۲۲/جون

روبی کا رزلٹ گیا۔ اتنی بڑی خوشی کا کیسے متحمل ہوسکے گا مگر میرا دل ۴ بجے صبح __ رات ڈائری لکھنے بیٹھا تو کسی کو روبی کے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ پیچھے پیچھے گیا وہی اختر تھا۔ اور میری آنکھوں نے وہ دیکھ لیا جس کا مجھے یقین نہ تھا۔ اس صدمے نے میرے دل کو بےحس کردیا ہے۔ اب جی کر کیا کروں گا۔ زندگی نے جس سے جینے کی روشنی پائی وہی چراغ دوسرے کے گھر روشن ہوگیا — روبی کی خوشی اسی میں ہے۔ ساری رات بارش ہوتی رہی اور میں باہر گھومتا رہا۔ ابھی اندر آیا ہوں کہ سینے کا درد برداشت سے باہر ہے۔"

"۲۳/جون

یہ لوگ ڈاکٹروں کو بلاتے ہیں— نادان— مجھے زندگی نہیں چاہئے۔ مجھے......''

اور اس کے بعد ڈائری کے صفحات صاف تھے۔

میں نے شروع سے ڈائری پڑھنی شروع کی تو پتہ چلا کہ ارشد شروع سے کتنے زندہ دل تھے— ڈر اور دہشت کے مارے میرا رواں کانپ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا میں بھی پاگل ہوجاؤں گی۔ ارشد اور مجھ سے— پیار— اُف کیسے ممکن ہے وہ نفرت— وہ عداوت— کیا سب مصنوعی تھا— وہ بے جا مخالفت۔ وہ اٹھتے بیٹھتے طنز وہ سب جھوٹ تھا۔ مجھے ارشد بھیا سے زیادہ اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔

دوسری صبح میں نے ڈائری کو چپکے سے وہیں رکھ دیا۔ ارشد بھائی زیادہ علیل تھے۔ مگر ان کے کمرے تک جانے کی کس میں ہمت تھی۔ بڑی ماں انتہائی پریشان تھیں۔ نواب صاحب کو کچھ فالج کے اس حملے نے اتنا کمزور کردیا تھا کہ انھیں منصور بھیا ارشد بھائی کے کمرے تک جانے ہی نہ دیتے تھے۔ پاپا کے آنے کی خوشی ان فکروں میں تحلیل ہوگئی تھی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اتنی بڑی خوش خبری کو میرا دل برداشت ہی نہ کرسکے گا۔ اسی لیے تو اسے غموں کے رنگ میں ڈبو دیا۔

ڈاکٹر اسلم روز ارشد بھائی کو دیکھنے آتے تھے۔ دو ایک بار ناز بھی آئی۔ ارشد بھائی اس حد تک کمزور ہوگئے تھے کہ ان پر دائم المریض ہونے کا شبہ گذرتا تھا۔ شاذ ہی بولتے تھے۔ اور جو کچھ بولتے تھے بے ربط ہوتا تھا۔

پاپا کے آنے میں دو دن باقی تھے کہ میں ناز کو ملنے گئی۔ جب سے ناز کا بیاہ ہوا تھا مجھے اس سے بھی خوف آنے لگا تھا (اس خوف کا نفسیاتی تجربہ کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی)

ناز نہانے گئی تو میں ریڈیو کے پاس بیٹھ کر Commentary سننے لگی۔ ان دنوں اس چیز کا جنون سا ہو رہا تھا۔ اچانک اسلم آ گئے۔

''تشریف رکھئے۔'' انھوں نے مجھے اُٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''ناز کہاں ہے؟''

''نہانے گئی ہیں۔''

''اچھا ہوا۔ آپ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔''

''کیا مطلب؟''

''شاید آپ کو یاد ہو آپ نے میرا ایک قرض چکانا ہے۔''

''قرض—؟''

''میرا مطلب ایک وعدے سے ہے۔''

''جی—؟''

''تو کیا ارادہ ہے؟''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے اس برتے پر کہا کہ دو دن بعد پاپا آ ہی رہے تھے۔

''تو سنئے مس ممتاز! آپ نے وعدہ لیا تھا کہ ناز سے بیاہ کرلوں۔ میں وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ— اختر سے بیاہ نہ کریں گی۔ کسی صورت میں—!!''

''جی—''

''میرا خیال ہے میں نے اپنی بات بڑی صاف زبان میں کہی ہے۔''

میں بالکل خاموش رہی۔

''رات ارشد کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اُسے میری موجودگی تک کا علم نہ ہوا۔ اس کی باتوں سے مجھے اختر صاحب کی بابت سب کچھ پتہ چلا اور ان کے لیے آپ کے جذبات کا بھی پتہ چلا— بے چارہ ارشد— مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہوگیا۔ کہئے اب کیا ارادہ ہے؟''

''اسلم بھیا! وہ تو میری زندگی ہیں۔''

''اور میں نے زندگی سے بڑی شے مانگنے کا وعدہ کیا تھا۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دوں ناز آ گئی۔ شام کو کار پر سوار کراتے وقت ڈاکٹر نے پھر اپنے وعدے کا جواب مانگا۔

''آپ مطمئن رہئے۔'' میں نے اس لیے کہا کیونکہ پاپا کے آنے کا خود مجھے بڑا اطمینان تھا۔

وہ دو دن کیسے گذرے—؟ صرف دل جانتا ہے۔ رات کو بھی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر جمی رہتی تھیں۔ مگر وہ کم بخت ہلتی ہی نہ تھیں۔ پاپا کو دیکھنے اور ملنے کی خوشی۔ زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو رہی تھی۔ پاپا صرف پندرہ دن کے لیے آ رہے تھے۔ اس لیے میں نے چپکے چپکے سب تیاری کر رکھی تھی...... وہ گھر چھوڑنے کا دکھ تو ضرور تھا— کیونکہ وہاں کے ذرّے ذرّے سے پیار ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس کی یاد سے تلخیاں بھی وابستہ ہوں گی۔ مگر کیا اس گھر کی اس کے افراد کی یاد مجھے خون کے آنسو نہ رُلائے گی؟

اتنے دنوں ارشد بھیا کے پاس نہ گئی۔ ڈاکٹر نے ان کے پاس سب کا جانا منع کر رکھا تھا۔ میں انتہائی کوشش سے ارشد بھیا کے خیال کو دماغ سے دور رکھتی— کیونکہ وہ خیال مجھے بوکھلا دیتا تھا— آخر وہ وقت بھی آ گیا جب پاپا ہوائی جہاز پر چڑھے ہوں گے۔ صرف اٹھارہ گھنٹے بعد وہ اپنے ملک میں ہوں گے۔ اور پانچ گھنٹے بعد میرے پاس— اوہ مولا! اس خوشی کی تیزی کو ہلکا کر دے تاکہ میرا دل نہ پھٹ جائے۔

دوسرے دن وقت گذارنے کے بہانے ڈھونڈتی۔ مگر کسی کام میں دل ہی نہ لگتا تھا۔ ادھر بوا کا بھی یہی حال تھا۔ صبح سے دوپہر تک میمونہ کی گڑیوں کے کپڑے سیتی رہی۔ فرحت اور فرخندہ بھی ساتھ رہیں۔ جب سے فرخندہ نے میرے جانے کا سنا تھا میرے ساتھ خوشی سے بات چیت کرتی تھی۔ آخر تنگ آ کر اُٹھی اور Commentary سننے لگی۔ فرحت اور فرخندہ ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔ میمونہ ذرا پرے تھی۔ میں Commentary سمجھاتی رہی تھی۔ ایک بجے خبریں شروع ہوئیں۔ کھانے کے لیے بوا بلانے بھی آئی۔ مگر نجانے کیوں جی اُٹھنے کو نہ چاہتا تھا— خاموشی سے خبریں سنتے رہے— اور اتنا یاد ہے اناؤنسر نے کہا تھا کہ

''آج انگلینڈ سے جو ہوائی جہاز بیس مسافروں کو لے کر آ رہا تھا۔ راستے میں گر کر پاش پاش ہو گیا۔ ہلاک ہونے والوں کے نام یہ ہیں:— عبدالرحمٰن— خلیل احمد— سر محمد ممتاز—!!''

(حالات کے پیش نظر یہ آخری قسط بجائے روبی کے رضیہ کے قلم سے لکھوائی

جارہی ہے۔ امید ہے یہ تبدیلی پسند کی جائے گی۔ وہی رضیہ جنہیں روبی ہمیشہ رضو آپی کہتی رہی ہیں)

اب کیا رہ گیا اس گھر میں—؟

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

روبی پاری کا یہ کاغذوں کا پلندہ مجھے دے گئی ہے کہ اسے تکمیل تک پہنچاؤں۔ اس کہانی کو اختتام تک گھسیٹ کر لے جاؤں۔ اس اختتام تک جو بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جس کے تصور ہی سے روح بھی کانپ اُٹھتی ہے۔ میں روبی سے کہہ نہ سکی کہ ''میری جان! تمہاری کہانی تو آج سے چھ ماہ پیشتر ختم ہوگئی تھی۔ اور اس کا اعلان تو باقاعدہ ریڈیو پر ہوا تھا۔ تمہاری کہانی کا آخری حصہ بڑا ہی اندوہناک تھا جسے سننے کے لیے تم اکیلی ہی ریڈیو کے پاس بیٹھی تھیں۔ جس دکھ کو تم اکیلی نے سہہ لیا۔ جو دکھ تمہاری مقدس روح سے دیمک کی طرح چمٹ گیا۔ روبی! تمہاری روشن آنکھوں میں غم کے اندھیرے بس گئے۔ تمھارے دمکتے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے۔ کبھی یہ گڑھے تمھارے ہنسنے پر پڑا کرتے تھے۔ اور اب یہ ہنسی تمھارا مذاق اڑانے کے لیے اپنا نشان چھوڑ گئی ہے۔ روبی! میں بھی تمھارے اس غم میں شریک نہ ہوسکی۔ تم سے دور— راجگڑھ کے غمکدوں سے دور میں کسی اور ہی دنیا میں خوش تھی۔ وہ تو سلیم کو امریکہ جانے کا حکم آیا تو وہ مجھے چھوڑنے راجگڑھ آ گئے۔ اور جانتی ہو روبی! میں کیا کیا ارمان چھپائے دل میں آئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج میرے آنے سے گھر میں خوشیوں کے شادیانے بجیں گے۔ میرے ننھے سے بچے کو دیکھ کر خوشی کے مارے تمھارا کیا حال ہوگا— تم مجھے چھیڑو گی— ستاؤ گی اور بار بار کہو گی— آپی! ننھے کو دے جاؤ۔ میں نے سلیم کو اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دینے دی۔ میں چاہتی تھی اچانک گھر پہنچ جاؤں تاکہ غیر متوقع طور پر خوشی ہو— اور جانتی ہو پگلی! جو کچھ میں نے دیکھا وہ گھر والوں کے لیے نہیں میرے لیے غیر متوقع تھا— اتنی بڑی حویلی جہاں مغلانیوں اور چوکیداروں کا شور ہوتا تھا— خاموش تھی— نہ ارشد کے قہقہے تھے نہ ابا حضور کی بارعب آواز— پھول اور پتے گھر کے ماتم میں شریک تھے۔ جبھی تو ان کے چہرے

مُرجھا گئے تھے۔ پورچ میں تین کاریں کھڑی تھیں — اور مالی نے مجھے بتایا کہ وہ کاریں ڈاکٹروں کی تھیں۔ جنہیں شہر سے بلوایا گیا تھا۔

''مالی بابا! گھر میں کون بیمار ہے؟'' سلیم کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

''حضور! بڑے سرکار بیمار ہیں۔''

''کیا ہوا میرے ابا کو؟ بولو مالی — کیا ہوگیا انھیں؟'' غم نے مجھے بھلا دیا کہ کبھی ہمارا مالی سے مخاطب ہونا گناہ سمجھا جاتا تھا۔

''چھوٹی بی بی! یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ تمھارے جاتے ہی اس حویلی پر بجلیاں گر پڑیں۔''

سلیم نے مجھے سہارا دیا۔ اور مالی پھر بولنے لگا۔ ''صاحبزادی! آج سے تین ماہ ارشد بیٹا بیمار ہوئے۔ وہ اچھے نہ ہوئے تھے کہ صاحبزادی روبی کے والد صاحب کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اور اس کے بعد — اس کے بعد —'' مالی رونے لگا۔

''اس کے بعد کیا ہوا مالی! — کیا ہوا —؟''

''اس کے بعد سرکار اس گھر کے چراغ میں روشنی تو رہی مگر وہ بے آواز ہوگیا۔''

''کیا مطلب —؟''

''بڑے سرکار پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا اور ان کی — اپنی زبان اور اوپر کا جسم بے حس وحرکت ہوگیا۔''

اس سے زیادہ میں نہ سن سکی۔ مجھے رنج تھا تو اس بات کا تین مہینے گذر گئے۔ اور کسی نے مجھے اطلاع نہ دی۔

ارشد باتوں کی آواز سن کر باہر آ گیا اور میری ٹانگوں سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رویا — وہی ارشد میرا بھائی جس کے قہقہوں سے میرے سر میں درد شروع ہوجایا کرتا تھا۔ اور جسے اس روز میں پہچان بھی نہ سکی۔

''ارشد! ابا حضور کو کیا ہوگیا میرے ابا کو کیا کردیا تم نے؟''

''رضو! یہاں کے رہنے والوں کے ستاروں کا قیام زحل کے منحوس برجوں میں

ہوگیا ہے۔تم چلی جاؤ۔کہیں یہ سائے تمھیں بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لیں— چلی جاؤ یہاں سے— یہاں نحوست غم اور بیماری پلتی ہے۔ جاؤ ہم نے تمھیں خوشیاں دے کر وداع کیا تھا۔ ہمارے غم میں شریک ہونے نہ آؤ۔ لے جاؤ اپنے بچے کو بھی— اسے دعائیں دینے والی زبان چپ ہوگئی۔ اسے گود میں لینے والے بازو بے حس و حرکت ہوگئے— جس سینے پر بٹھا کر اس سے لاڈ کرتے تھے وہ پتھر ہوگیا— تمھیں آپی پاری کہہ کر بلانے والی کی آنکھیں ساون کی گھٹائیں ہیں۔ جس کی زبان اب مہینوں بعد کوئی لفظ ادا کرتی ہے— رضو! چلی جاؤ یہاں سے۔ منصور بھیا کی سنجیدگی تمھیں کاٹنے کو دوڑے گی۔ رانی ماں کا چہرہ دیکھنے کی تم میں طاقت کہاں— جاؤ— جاؤ چلی جاؤ یہاں سے—''

''ارشد! ہوش میں آؤ— کیسی باتیں کر رہے ہو دیکھتے نہیں تمہاری باتیں سن کر تمہاری بہن کی کیا حالت ہوگئی ہے۔''

اور سلیم مجھے سہارا دے کر اندر لے گئے۔ سب سے ملنے کا سماں بے رحم آسمان کو بھی رلانے والا تھا۔

سلیم اسی ہفتے امریکہ چلے گئے۔ ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باوجود ابا حضور کی قوتِ گویائی واپس نہ آسکی اور وہ ہمیشہ دعائیں دینے والی زبان چپ ہوگئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ غم کا اثر کم ہوتا گیا۔ وقت ہر زخم کی ٹیس تو کم کر دیتا ہے۔ مگر روبی! تین مہینے مجھے آئے ہوئے ہوگئے اور اس طرح چھ ماہ گذر گئے۔ مگر روبی! تمھارے چہرے کی کھوئی ہوئی بشاشت نہ لوٹی۔ سنجیدہ تو سبھی تھے۔ مگر تم نجانے کیا سے کیا ہوگئیں۔ تمھیں بہلانے کی کیا کیا کوششیں ہوئیں۔ مگر افسوس بڑی ماں کا پتھر دل تمہاری اس بے بسی پر بھی نہ پگھلا میں نے اپنا بچہ تمھیں سنبھالنے کو دے دیا۔ تاکہ اس کے کاموں میں لگی رہو۔ اور یہ دیکھ کر ہم سب کتنا خوش ہوئے کہ تم اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی ہنسنے بھی لگیں۔

ابا حضور کی عیادت کے لیے سبھی عزیز رشتہ دار آتے رہے۔ ماموں جی اور اختر بھیا بھی اکثر آتے۔ کرنل زیدی کے علاج سے ابا حضور کے دائیں بازو میں حرکت آ گئی۔

یہ اتنی سی بات ہمارے لیے خوشی تھی۔ اور اس خوشی میں شریک ہونے ماما جی آئے۔ اور نجانے ماما جی نے بڑی ماں سے کیا کہا کہ جو وہ مصر ہوگئیں کہ — روبی کی شادی سلیمان ماموں سے ہوگی—!

''میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوسکتا۔'' منصور بھیا جوش میں آ کر بولے۔

''کیوں کیا یہ انوکھی بات ہے اس گھر میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے اور دوسری شادی گناہ نہیں۔''

''بڑی ماں! آپ یہ نہیں سوچتیں کہ روبی ماموں کی لڑکیوں سے بھی چھوٹی ہے۔''

''منصور! یہ مت بھولو کہ تمھارے باپ نے جب دوسری شادی کی تھی تو رانی کی عمر ان کی عمر کے تیسرے حصے کے برابر تھی۔''

''مگر ماں جی! یہ ظلم ہے۔ میں یہ ظلم نہ ہونے دوں گا۔''

''منصور! تمہاری ماں اس لیے زندہ ہیں کہ اپنی ناخلف اولاد سے سب کے سامنے ظالم ہونے کا طعنہ سنیں۔''

''مگر ماں جی! ذرا سوچئے تو آپ کیا کرنے جارہی ہیں دنیا کیا کہے گی اور پھر آپ نے روبی سے بھی نہیں پوچھا۔

''تم مجھے دین سے اتنا بے بہرہ سمجھتے ہو کہ بغیر لڑکی کی مرضی معلوم کیئے بیاہ کردوں گی۔''

''مگر اماں! ابا حضور کی اجازت کون دے گا؟'' ارشد پہلی مرتبہ بولے۔

ابا حضور کی بے بسی کا خیال کر کے بڑی اماں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئیں۔

''وہ بول نہیں سکتے مگر میں لکھوا کر ساری بات ان کے سامنے رکھ دوں گی۔ انھیں ہاں کرنی ہی پڑے گی۔''

''ماں جی! اگر ابا حضور کو خدا ایک لمحے کے لیے قوتِ گویائی دے کر یہ کہے کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ لو۔ وہ صرف اس بیاہ کے لیے انکار کرکے اس خالق کا شکر ادا کریں گے جس نے انھیں انکار کرنے کی توفیق بخشی۔''

''منصور! مت بھولو کہ رضیہ کے بیاہ پر تم نے مجھے باتوں سے پھسلا لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یہ پہلی اور آخری چیز آپ سے مانگتا ہوں اس کے بعد اور کچھ نہ مانگوں گا۔ میں نے یہی سمجھ کر ہاں کی تھی کہ تم اس کے بعد کچھ نہ مانگو گے۔ اپنے الفاظ کو نبھاؤ۔ منصور! تمہاری ماں ایک دفعہ اتنی بڑی قربانی دے چکی اب نہ دے گی۔''

''مگر ماں جی! رضیہ آپ کی اپنی بیٹی تھی۔ روبی غیر ہے اس پر آپ کو اختیار نہیں۔'' ظفر بھائی نے التجا کی۔

''ظفر! روبی اب اور یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم خاندان کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھ سکتے۔ جو اسی دن سے باتیں بنا رہے ہیں جب سے روبی یہاں آئی ہے۔ میں اسے سلیمان سے بیاہ کر اس کا جائز حق اس گھر پر ثابت کردوں گی۔ اگر سوچو تو روبی کے ساتھ یہ بھلائی ہے۔''

''ویسے اگر یوں دیکھا جائے تو واقعی روبی کے ساتھ یہ بھلائی ہے۔'' رانی ماں بھی عمر، خیالات اور جذبات کے اس تفاوت کو نہ دیکھ سکیں۔ جو معصوم روبی اور ماموں میں تھا۔

''ماں جی! اگر آپ اپنے فیصلے پر غور نہیں کریں گی تو مجھے بھی کہنے دیجئے کہ ماموں کی بارات میری لاش کو روند کر اس گھر میں آئے گی۔'' منصور بھیا اپنی زندگی کی بازی لگانے پر تل گئے۔

''منصور! اپنے الفاظ کا خیال رکھو۔ مغل اپنے الفاظ سے پھرا نہیں کرتے۔''

''مگر ماں جی! یہ صرف منصور بھیا کی بات نہیں ہم سب کی لاشیں آپ کو دیکھنی پڑیں گی۔ جب ماموں یہاں سے روبی کو لے جانے آئیں گے۔''

''ارشد! ماں کی ممتا اور بھائی کی محبت کا امتحان نہ لو۔ شاید دونوں خاندان کی عزت کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوں۔''

''کیا خاندان کی عزت آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہے؟''

''بیشک۔'' بڑی ماں کی آواز بھرّا گئی۔ ''اولاد اسی لیے ہوتی ہے کہ باپ دادا کا نام روشن کرے اس لیے نہیں کہ خاندان کی عزت کا جنازہ نکال دے۔''

''ماں جی! میری زندگی میں یہ نہ ہوگا۔ ابا حضور نے سب کچھ مجھے سب دے دیا ہے۔ تو ان کی زبان بھی میری زبان ہے میرے ہاں کہے بغیر کچھ نہ ہوگا۔''

منصور بھیا نے زندگی میں پہلی بار ماں کے حضور گستاخی کی۔

''منصور! ماں کو ریاست کے رعب سے ڈرانے آیا ہے۔ یاد رکھ تمھارا باپ زندہ ہے۔ وہ اب بھی یہ حق تم سے چھین سکتا ہے۔''

''ماں جی! مجھے ریاست آپ کے قدموں سے زیادہ عزیز نہیں۔ مگر آپ جانتی ہیں قانون کی رُو سے میرا ہاں کہنا ضروری ہے۔''

''منصور! تم ماں کے کہنے کو قانون سے زیادہ اہمیت دو گے۔''

''ماں جی—'' منصور بھائی نے بڑی ماں کے قدم پکڑ لیے۔

''منصور! ماں کا مان بڑھاؤ۔ رضیہ کو ساتھ لے جا کر روبی کی مرضی معلوم کرو۔''

''میں پوچھنے نہیں جاؤں گی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں ماں جی! میں بھی ایسا نہ کروں گا۔ آپ ایسا نہیں کریں گی۔''

''میں ایسا نہیں کروں گی مگر ایک شرط ہے۔''

''مجھے وہ شرط منظور ہے۔''

''پہلے سن لو۔ شاید تم اسے منظور نہ کرسکو۔''

''روبی کی خوشی کے لیے ہمیں سب کچھ منظور ہے۔ ابا حضور اسے بیٹی بنا کر لائے تھے۔ وہ فرحت اور فرخندہ کی طرح ہماری حمایت حاصل کرے گی۔'' ارشد بڑے جوش میں بولے۔

''اچھا تو منصور! تمھیں وہ شرط منظور ہے۔ اور وہ شرط صرف اتنی ہے کہ روبی کو یہاں رکھنے کے لیے میں رضیہ کو بھی یہاں رکھوں گی۔ اور تمھیں سلیم کو امریکہ لکھنا ہوگا کہ وہ رضیہ کو طلاق بھجوادے—!!''

''ماں جی—!! سب بھائی چونک پڑے۔

''بس مان گئے نا اب روبی سے میں خود بات کرتی ہوں جا کر۔''

اور نہ جانے ماں جی نے تم سے کیا کہا۔ اور تم نے کیا جواب دیا۔ کسی کو تمھارا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ ارشد بضد تھے کہ تمھیں کہیں لے جا کر چھپا دیا جائے۔ مگر ابا حضور کی عزت کا مسئلہ درپیش تھا۔

آخر ماموں تاریخ لے کر سدھارے۔ ہمارے خاندان میں یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی۔ جو کوئی تعجب کرتا۔

آخر ہم نے صلاح کی کہ نکاح کے وقت تم سے انکار کرا دیں۔ تمہاری خوشیاں اور گھر کی جھوٹی عزت کو تولا تو تمھاری زندگی کا پلڑا بھاری رہا۔

بیاہ سے تین دن پہلے تم نے ہم سے وعدہ کیا کہ تم ضرور انکار کر دو گی۔ اسی بناء پر ہم نے بڑی ماں کے کہنے پر بھی تمھارے جوڑے آخری وقت تک تیار نہ کئے۔

برات آ گئی۔ نجانے میرے دل کو کیوں اطمینان نہ تھا۔

ابا حضور کی آنکھوں میں نہ بولنے کی حسرت تھی۔ وہ حرکت بھی تو نہ کر سکتے تھے۔ ورنہ روبی! وہ تمھارے خون سے یوں ہولی نہ کھیلنے دیتے۔

بارات کے ساتھ اختر نہ تھے۔ ماما جی نے بتایا کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور کوئی اطلاع بھی نہیں بھجوائی۔

نکاح کا وقت آ گیا۔ منصور بھیا نے خاندان اور ماں کی عزت رکھنے کے لیے اجازت دے دی۔ اس اطمینان پر کہ روبی تو انکار کر ہی دے گی۔

نکاح کے وقت ہم سب تمھارے نزدیک بیٹھے تھے۔ تمہاری نظریں نجانے کسے ڈھونڈ رہی تھیں—— تمہاری آنکھوں میں ایک آنسو نہ تھا۔ مجھے ڈر لگا تمھیں سکتہ تو نہیں ہو گیا۔

تمھارے سر پر بڑی ماں نے ہاتھ رکھا—— کندھے پر منصور بھیا نے—— دائیں طرف میں تھی اور بائیں طرف ارشد بھیا۔

قاضی جی نے نکاح کا خطبہ شروع کیا اور تم سے پوچھا—— اور روبی——! روبی! تم نے ''ہاں'' کہہ دی۔

منصور بھیا چیخ پڑے۔ ''روبی! تم نے کیا کر دیا؟''
بڑی ماں باہر چلی گئیں۔ مجھ میں بولنے کی سکت ہی نہ رہی۔
''روبی! یہ تم نے کیا کیا۔ ہمارا بنابنایا محل مسمار کر دیا۔''
''بھیا! میں اپنے محل کی بنیادیں اس محل کے کھنڈرات پر نہیں رکھنا چاہتی جس نے مجھے پناہ دی۔ میں اس شفیق انسان کے گھر پر انگلیاں اٹھتے کیسے دیکھ لیتی جس نے مجھے بیٹی بنا کر رکھا۔ میرا فرض مجھ سے قربانی مانگتا تھا۔''
''روبی! آپ نے زندگی کی قربانی کیوں دے دی؟''
''میرے پاس اور تھا ہی کیا جو دیتی۔''
''روبی! آپ سچ مچ چلی جائیں گی؟'' ظفر بھیا رونے لگے۔
''روبی! اس خاندان کی عزت کو تمھارے خون کی نہیں میرے خون کی ضرورت تھی۔ میں نے کیوں ہاں کہہ دی۔''
ارشد پر پھر پاگل پن کا دورہ پڑا۔ اور وہ بے معنی کھوکھلے قہقہے لگاتا باہر چلا گیا۔
رات میں تمھارے پاس ہی لیٹی اور تم نے مجھے کاغذوں کا پلندہ دے کر کہا۔
''اس کہانی کو ختم کر دینا آپی! اور جب — کبھی بھی اختر آئیں انھیں دے دینا۔ اور کہہ دینا روبی اپنی تقدیر سے نہ لڑ سکی۔''
''تو روبی — ! اختر؟''
''ہاں آپی! کل شام ان کا خط آیا تھا۔ نجانے کن صحراؤں سے۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ گئے — کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ انھوں نے ہر بات کا الزام میرے سر لگایا ہے۔ اور مجھے بے وفا — ڈائن — اور خوشیاں لُوٹنے والی ناگن کا خطاب دیا ہے — مجھے اب کوئی رنج نہیں رہا۔ جس شاخ پر سہارا تھا وہ اپنا بوجھ نہ سہہ سکی اور اس کے ٹوٹتے ہی مجھے دکھوں نے آلیا۔ آپی! زندگی اسی کی ہے جو دوسروں کی خاطر جیتا ہے۔ پھر آپ کیوں غم کرتی ہیں۔ میں تو خوش ہوں۔ بہت خوش۔''
''روبی! تم یوں رک رک کر ڈوبی ہوئی آواز میں بول رہی تھیں جیسے کوئی نزع

کی حالت میں ہو— سُرخ کپڑوں میں تمھارا پیلا رنگ اور بھی پیلا لگتا تھا۔ اتنے بھاری زیور تمھارے نازک سے بدن پر پتھروں کی طرح پڑے تھے۔

صبح اٹھ کر جب تمھیں دوسرے کپڑے پہنائے گئے تو نجانے کیوں تمھیں بوا کا خیال آ گیا۔ جسے صدموں نے تم سے بھی زیادہ لاغر کر دیا تھا۔

بوا کے کمرے میں آنے تک تمھیں سارا زیور پہنا دیا گیا۔ اور جب بوا آئی تو— تم نے کہا۔

''بوا! تمھیں اپنی روبی کو دلہن بنے دیکھنے کی بڑی تمنا تھی نا— دیکھ لو— جی بھر کے دیکھ لو۔ پھر روبی تمھیں نظر نہ آئے گی— اور جب دیکھ چکو تو چلی جانا اپنے گھر— اپنے وطن۔''

اور بوا جو بلک بلک کر روئی ہے تو بس پتھروں کا کلیجہ بھی شق ہو گیا۔ مگر روبی! تمہاری آنکھیں پھر بھی خشک رہیں۔

تمہاری دوست ناز تمھیں رخصت کرنے بھی نہ آئی۔ بھائیوں میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمھیں موت کی وادیوں میں دھکیل آتے۔

ابا حضور سے ملنے تم خود گئیں— اور صرف ان کے قدموں پر سر رکھ کر لوٹ آئیں— روبی! اس وقت میرا دل چاہا کہ میں نے بڑی اماں کی شرط مان لی ہوتی۔

نامعلوم منصور بھیا تمھیں کیا کہنا چاہتے تھے جو وہ تمھارے کمرے تک گئے۔

اور دس بجتے ہی کاروں کے ہارن بجنا شروع ہوئے۔ تمھارے چھوٹے سے نازک جسم کو برقعے میں لپیٹ دیا گیا۔ اور سب تمھیں پیار دے کر رخصت کرنے لگے۔ صرف ہمارا دل جانتا ہے روبی! یہ دکھ ہم نے کیسے برداشت کر لیا۔

جاتے جاتے تمھیں میمونہ نے روک لیا اور وہ پگلی تمھارے قدموں سے لپٹ گئی— ننھا بھی تمہاری گود سے نہ اُترتا تھا۔ روبی!— سب روتے تھے— مگر تمہاری آنکھیں خشک ہی رہیں۔ کتنی کٹھور ہو تم روبی—! اپنے معصوم دل پر اتنا ظلم کرتی ہو۔

اور وہ سیاہ کار تمھیں دور لے گئی روبی—! خدا شاہد ہے تمھارا جنازہ بھیج کر ہم

اتنا نہ روتے روبی — ! اتنا نہ روتے — تمھیں سُرخ کفن پہنا کر رخصت نہ کیا تھا۔ کفن تو سفید ہی تھا۔ اسے تمھارے اور اختر بھیا کے ارمانوں کے خون سے سرخ کر دیا۔ تمھارے ماتھے پر جھلملاتے جھومر کی لڑیوں میں موتی نہ تھے — آنسو تھے۔ روبی! انسان جان قربان کرسکتا ہے۔ مگر تم نے جو کچھ قربان کیا اسے کوئی انسان قربان نہیں کرسکتا۔ بہاروں کی طرح مسکرانے والی روبی! تمھیں خزاں نے کیسے آلیا۔ مجھے اپنا دل تو دکھا دیا ہوتا۔ تاکہ یہ پتہ چل جاتا ایک معصوم روح کے سینے کو چھلنی کرنے کے لیے کتنے تیروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

روبی! خدا کے بعد اگر سجدہ جائز ہوتا تو میرا سر تمھارے آگے جھک جاتا — تمہاری امانت اور پیغام کو کبھی بھی اختر بھیا تک نہ پہنچا سکوں گی۔ میں جانتی ہوں وہ کبھی واپس نہ لوٹیں گے۔ اور تمہاری آپی یہ ذرا سا کام بھی نہ کر سکے گی۔

روبی! واپس لوٹ آؤ — میں اُداس ہوں — گھر اُداس ہے — بھائی اُداس ہیں — ننھا اُداس ہے روبی! ممتاز چچا کی ہڈیوں کی مٹی اڑ اڑ کر تمھارا پتہ پوچھتی ہے۔ آجاؤ — ہم سے روٹھی ہو اپنے باپ سے نہ روٹھو۔ ہوا بھی نہیں چل رہی روبی! مگر تمھارے کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں کے پٹ خواہ مخواہ شور مچا رہے ہیں۔ تمہاری تصویر نجانے کیسے گر کر ٹوٹ گئی ہے۔ ہم میں سے اُسے کوئی بھی نہ اٹھا سکا۔ ہم ہی تو ہیں جنہوں نے تمھیں زمین پر پھینکا ہے۔ خود ہی گرا کر خود ہی کیسے اٹھائیں — بوا نے شیشے کے ٹکڑوں کو دامن میں باندھ لیا تھا۔ اور — پھر وہ بھی چلی گئی۔

روبی! تم جاتے جاتے جو کچھ منصور بھیا سے کہہ گئی ہو مجھے پتہ چل گیا۔

بھیا نے تم سے کہا تھا۔

''روبی! ایسی حالت میں انسان زندگی کو ختم کرنے کا گناہ کر گذرتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تم فرشتہ ہو کر ایسا کرو۔''

اور تم نے جواب دیا تھا۔

''بھیا! خودکشی تو وہ کرے جس میں زندگی باقی ہو۔ میں جیوں گی جب تک جی

سکوں گی۔"

"جی سکو گی روبی؟"

"ہاں بھیا!— جینے والے جیا ہی کرتے ہیں۔"

"مگر روبی—! یہ مت بھولنا— جینے کو تو ہر شخص جی لیتا ہے مگر جینے کی بات اور ہے۔"

اور یوں تم چلی گئیں۔

روبی! میرے آنسو تمھیں بلاتے ہیں— انھیں پونچھ دو آ کر— میری سسکیوں کو روکنے آ جاؤ— ارشد کے قہقہوں کو دھیما کرنے آ جاؤ— روبی! زندگی کے مقابلے میں کہیں تمہاری ناتواں جان ہار نہ جائے آ جاؤ— سہارا لے لو— پگلی! تو نے اپنی تمام خوشیاں دوسروں پر نچھاور کر دیں۔ اور اپنا دامن دکھوں سے بھر لیا۔

تُو تو مجھے آپی کہا کرتی تھی— اپنا آدھا دکھ ہی مجھے دے جاؤ— روبی! کاش میں تمھارے لیے کچھ کر ہی سکتی۔

روبی! ننھا روتا ہے۔ ہم سے نہ بولو۔ اس نے تو تمھارا کچھ نہیں بگاڑا۔ میمونہ کی گرمیوں کے کپڑے سینے آ جاؤ— روبی! تو نے زندگی دے کر موت خرید لی۔ اور ہم سب نے اس میں دلالی کی ہے— ہم سب بُرے ہیں روبی!

روبی! لو تمہاری کہانی میں نے ختم کر دی۔ بلکہ تم خود ہی اسے ختم کر گئی ہو۔ اب بہاروں کے قصے کون کہے گا— بہار تو تم تھیں۔ اب خزاؤں میں رہنا روبی— اور— جیتی رہنا— سکھی تو کیا رہو گی۔

OOO